سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۵

عورت

ناول

JAF & CO.
Plot # 43/4, Q-2, Block-6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

از

رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

چھٹا ایڈیشن مئی ۱۹۶۷ء

6.00

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور
سے طبع کرا کے کشمیری بازار لاہور سے شائع کی

عورت

۱	نوشابہ	۹	۱۴	اے عشق کہیں لے چل	۱۰۲
۲	زمانہ کی کروٹ	۱۲	۱۵	مسافر خانہ	۱۰۷
۳	پہلی ملاقات	۱۶	۱۶	ایک اور مصیبت	۱۱۷
۴	شام کے دھندلکے میں	۲۱	۱۷	سلمیٰ	۱۲۷
۵	چاندنی	۲۸	۱۸	حسن اتفاق	۱۳۶
۶	آمنا سامنا	۳۴	۱۹	انور	۱۴۷
۷	میل جول	۴۰	۲۰	رنڈی کا کوٹھا	۱۵۵
۸	میلہ	۴۵	۲۱	تیر و نشتر	۱۶۸
۹	دریا کے کنارے	۵۲	۲۲	اسٹیڈیم میں	۱۸۱
۱۰	چہ میگوئیاں	۶۷	۲۳	توہین	۱۸۸
۱۱	چال	۷۵	۲۴	ایک رات	۱۹۷
۱۲	انتظار	۸۴	۲۵	پہلی ملاقات	۲۰۴
۱۳	افشائے راز	۹۳	۲۶	وعدے وعید	۲۱۵

۲۷	فیصلہ کن گفتگو	۲۲۵	۳۳	اگر پسر نتواند پدر تمام کند.	۲۸۷
۲۸	باتوں باتوں میں	۲۳۳	۳۴	یاد دہانی	۲۹۹
۲۹	کشاکش	۲۴۵	۳۵	کاروبار	۳۰۸
۳۰	عہد و پیماں	۲۵۱	۳۶	دعوت	۳۲۱
۳۱	تقاضا	۲۶۳	۳۷	تماشا	۳۳۰
۳۲	مرد کی غیرت	۲۷۵	۳۸	ڈراپ سین	۳۴۸

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(غالبؔ)

عجیب و غریب کہانی

یہ ایک عجیب و غریب عورت کی کہانی ہے، جو چاہی گئی اور جس نے چاہا لیکن چاہت کا پھل نہ ملا، چاہ راس نہ آئی اس نے اپنے تئیں مردوں کے بازار میں پیش بھی کیا اور بیچا بھی لیکن جب پیش کیا تو پوچھ نہ ہوئی جب بیچا تو انمول ہو گئی، اس نے عشق بھی کیا اور معشوقہ بھی بنی لیکن جب عشق کیا تو راندۂ درگاہ کر دی گئی اور جب معشوقہ بنی تو خلقت سجدہ میں جھک گئی، اس نے خدمت کرنی چاہی تو اس کے ہاتھ جھٹک دیے گئے لیکن خنجر لے کر قتل کرنے پر آمادہ ہوئی تو گردن خم ہو گئی۔

ایک روز اس عورت کی آنکھیں انتقام کی آگ سے سلگتے سلگتے دہکتا ہوا انگارہ بن گئیں لیکن جب اس نے اپنے دل کو کھرچا تو اس میں سوائے محبت کے کچھ نہ تھا۔

ناول میرا ہے، تخیل ایک انگریزی ناول سے ماخوذ، صرف تخیل، ورنہ شروع سے آخر تک ایک حرف شرمندۂ غیر نہیں ہے ؎

رئیس احمد جعفری

۲۴ اگست ۱۹۴۷ء

بمبئی

باب ۱

نوشابہ

وہ پھول کی طرح خوبصورت، ریشم کی طرح ملائم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھی، وہ حسین و خوب رو تھی۔ اس کے احساس کی آگ کو کوئی بھڑکانے والا نہ تھا۔ گاؤں کا ہر فرد اس کا کچھ نہ کچھ تھا، کوئی چچا، کوئی خالو، کوئی بابا، کوئی بھیا، یہ مقدس رشتے اپنی پوری معنویت کے ساتھ کارفرما تھے، جو چچا تھا وہ اسے پھل پھلاری میں تحفہ دیا کرتا تھا۔ جو خالو تھا، وہ اگر شہر جاتا، تو اس کے لیے گڑیاں ضرور لاتا، جو بابا تھا، وہ بازار ہاٹ جاتا تو ممکن نہ تھا کہ نوشابہ کے لیے کوئی کھانے پینے کی چیز نہ لائے، جو بھیا تھا، وہ اس کے ساتھ کھیلتا، سیر کرتا، کبھی کبھی لڑتا جھگڑتا بھی کبھی خفا ہو جاتا، کبھی منا لیتا، لیکن اس روٹھنے اور منانے میں نفس اور ہوس کی شرارت نہ تھی معصومیت اور سادگی کا پرتو تھا، سب جانتے تھے وہ خوبصورت ہے، لیکن کسی کے دل میں یہ خیال کبھی نہ آیا کہ خوبصورتی کو شوخ نظروں کا ہدف بھی بنایا جا سکتا ہے۔ وہ شاخِ گل کی طرح لچکتی اور کھلے ہوئے پھول کی طرح مسکراتی، گاؤں بھر کا چکر کاٹا کرتی لیکن نہ اسے دیکھ کر کوئی کھلکھلاتا، نہ سیٹی بجاتا، نہ ساتھ چلتا، اگر ساتھ چلتا تو گمراہ کرنے کیلیے نہیں، گھر تک پہنچانے کے لیے، گاؤں والے اسے دیکھ کر مسکراتے، وہ انھیں دیکھ کر مسکراتی لیکن اس مسکراہٹ میں سوائے پیار اور بھولے پن کے کچھ نہ ہوتا، اسے مسکراتے دیکھ کر دل

نہیں دھڑکتے تھے، وہ دوسروں کو مسکراتا دیکھ کر شرمانی نہیں تھی

اس گاؤں   شیخ پورہ   میں سب سے معزز گھر شیخ ساجد علی کا تھا
وہ کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن ان کی بہادری، شرافت، وضعداری اور امانت
کا سب لوگ لوہا مانتے تھے۔ گاؤں کے شورہ پشت لوگ بھی ان سے دبتے تھے اور
زمیندار بھی ان کا لحاظ کرتے تھے، وہ سب کے کام آتے تھے کسی سے اپنا کام نہیں
لیتے تھے، وہ سب کی مدد کرتے تھے مگر کسی کی مدد خود انھوں نے کبھی نہیں قبول کی۔ نوشابہ
انہی کی اکلوتی اور چہیتی لڑکی تھی، گاؤں میں پردہ کا رواج نہیں تھا، سب لوگ ایک
خاندان کی طرح رہتے تھے، اور خاندان کا میل جول پردہ کی پابندی کب گوارا کرتا ہے؟
پھر نوشابہ کی ابھی عمر ہی کیا تھی، یہی کوئی ۱۱-۱۲ سال، اور یہ عمر بھی دوسروں کے لیے
تھی، خود ساجد میاں اسے اب تک بالکل بچہ سمجھتے تھے، ان کے نزدیک آج سے بارہ سال
پہلے والی نوشابہ میں اور آج کی نوشابہ میں کوئی فرق نہیں ہوا تھا، اگر ہوا تھا تو بہت معمولی
مثلاً پہلے جب وہ اس سے پوچھتے تھے کہ شادی کس سے کروگی تو وہ بے تامل کبھی اپنی ماں
آمنہ بی کی طرف انگلی اٹھا دیتی اور کبھی اس کی نگاہ انتخاب ماں کے بجائے باپ پر پڑتی۔
اب جو فرق ہوا وہ صرف اتنا کہ وہ شادی کا نام سن کر شرما جاتی تھی، اب وہ اپنی شادی
نہ ماں سے کرنے کے پر تیار تھی، نہ باپ سے، حالانکہ کئی برس تک ان دونوں کو منتخب کر کر کے
دھوکا دیتی رہی، اب اس نے چپ سادھ لی تھی، سو یہ فرق کوئی ایسا بڑا فرق نہیں تھا جسے
ساجد میاں کوئی غیر معمولی اہمیت دیتے۔

گاؤں میں رہنے کے باوجود، وہ ذرا آزاد خیال تھے، نوشابہ جب کبھی اکیلے دو کیلے
گنگناتی تو وہ اس سے اصرار کر کر کے دیہاتی گیت سنا کرتے اور کبھی کبھی دوستوں کو بھی سنوا دیتے

س کی رسیلی آواز میں بلا کا جادو تھا۔ جو سنتا لوٹ جاتا۔ یہ خیال کسی کے دل میں نہ آیا کہ اگر تربیت کے لیے کسی فلم کمپنی کے اسٹڈیو میں بھیج دیا جائے تو یہ کانن بالا کے کان کترنے لگے گی اس لیے کہ خود یہاں کے لوگوں میں سے شاید ہی کسی نے کبھی کوئی فلم دیکھی ہو۔ ہاں سننے والوں میں سے بعض اس رائے کا اظہار ضرور کر دیتے تھے کہ لڑکی گاتی بڑا اچھا ہے خدا نظر بد سے بچائے

کچھ دنوں تک نوشابہ نے اسکول میں قرآن شریف اور اُردو کی تعلیم حاصل کی، اب ساجد میاں نے اسکول سے اُٹھا لیا تھا اور خود پڑھانے لگے تھے، بات یہ ہوئی تھی کہ مدرسے کے ملاّ نے ایک دفعہ نوشابہ کے چار طمانچے لگا دیئے تھے اور ساجد میاں کو یہ سن کر اتنا غصہ آ گیا تھا کہ اگر آمنہ بی ان کا دامن پکڑ کر آڑے نہ آجاتیں تو ملاّ جی پر آج بے بھاؤ کی پڑتیں، اس بات پر نوشابہ ماں سے خفا ہو گئی، وہ چاہتی تھی کہ ساجد میاں کو آمنہ بی باہر جانے دیں تاکہ وہ اس ملاّ کو ایسا سبق دیں کہ کبھی وہ بے ادبی اس کے ساتھ نہ کر سکے اور وہ اپنی سہیلیوں کو بتائے ہمارے ابا جی نے آج ملاّ جی کو اتنا مارا، اتنا مارا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ افسوس یہ حسرت پوری نہ ہوئی، آمنہ بی نے ساجد میاں کو روک لیا، اور ملاّ جی پٹنے سے بچ گئے ماں کا یہ جرم بیٹی کی نگاہ میں قطعاً ناقابل معافی تھا۔ اس نے کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا اور جب ماں نے وجہ پوچھی تو خفگی کے لہجہ میں بولی۔

تم نے ابا کو روکا کیوں؟ کیوں نہیں انہیں مارنے دیا ملاّ جی کو، بڑی آئیں کہیں کی، ہم نہیں کھاتے!

اماں آمنہ نے مسکرا کر اپنی بیٹی کو کلیجہ سے لگا لیا۔ اُسے خوب سا پیار کیا۔ اسی وقت ملیدہ تیار کر کے اپنے ہاتھوں سے کھلایا اور وعدہ کیا،

میں خود اپنے ہاتھوں سے ایسا ماروں گی تمہارے ملاّ جی کو، زندگی بھر یاد کریں گے اب ہاتھ لگا کے دیکھیں تو میری نوشابہ کو!"

باب ۲

زمانہ کی کروٹ

زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور اس کی ہر کروٹ مجبور اور بے کس انسان کی ہڈیاں توڑتی رہتی ہے عیش کے کتنے برس گذر گئے، اس کا پتہ بھی نہ چلا، دفعتہً ساجد میاں بیمار پڑے، شام کو بیمار ہوئے اور صبح ہوتے ہوتے اپنے رب سے جا ملے، گھر ماتم کدہ بن گیا، گاؤں کا ہر بوڑھا بچہ، اس غم میں آنسو بہا رہا تھا، زندگی میں تو کچھ ان کے مخالف بھی تھے لیکن موت کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی خوبیاں بیان کر کر کے رو نہ رہا ہو، جب تک وہ زندہ تھے ان کی بہت سی خوبیوں پر پردہ پڑا ہوا تھا لیکن جب مر گئے، تو وہ پردہ اُٹھ گیا، اور دوست دشمن سب ماتم کرنے لگے،

غم دھوپ کی طرح آتا ہے اور سایہ کی طرح گذر جاتا ہے، یہ غم بھی بہت جلد لوگوں کے دلوں سے فراموش ہو گیا، اس غم رفتہ کا کوئی نشان رہ گیا، تو صرف یہ کہ اگر کسی نے آمنہ بی کے دیدۂ تر کو دیکھ لیا تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر ساجد میاں کے فضائل و مناقب کو بیان کرنے لگا کسی نے نوشابہ کو میلے کچیلے کپڑوں میں مغموم و سوگوار دیکھ لیا تو گذرے ہوئے زمانہ مسرت کا بیان کر کے اظہار افسوس کرنے لگا۔ پھر قسمت کے سر سارا الزام ڈال کے اپنے کام دھندے میں مصروف ہو گیا۔

ساجد میاں تو عرصہ سے بیمار تھے لیکن وہ بیماری کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے تھے مرض کا مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ وہ خود و بیمانہ پر تجارت بھی کرتے تھے سب سے قریب شہر اس گاؤں سے بمبئی تھا، مہینہ میں ایک آدھ چکر دو ایک دن کے لیے وہ بمبئی کا ضرور لگاتے تھے، ہر دورہ میں کپڑا، برتن، چوڑیاں خرید لاتے اور تھوڑا طمع رکھ کر گاؤں والوں کے ہاتھ کچھ ادھار کچھ نقد بیچ دیتے تھے، اس مرتبہ جب وہ بمبئی سے آئے تو کراہتے ہوئے آئے ہی چارپائی پر لیٹ گئے، بخار پہلے سے تھا، اب بڑھ گیا، ہر قسم کی تدبیر کی گئی، مگر وہ بڑھتا ہی رہا، اور صبح کے وقت جب موذن اذان دے رہا تھا، وہ خدا کے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پہنچ گئے، بیماری کیا تھی، اس کی تشخیص آخر وقت تک نہیں ہو سکی، شیخ پورہ میں کوئی حکیم ڈاکٹر تو تھا نہیں، خاندانی مجربات اور ٹونے ٹوٹکوں سے کام لیا گیا مگر کوئی چیز بھی راس نہ آئی۔

ساجد میاں کے پاس کوئی جائداد نہیں تھی، صرف ایک کھیت تھا، ایک آم کا باغ، جو کاروبار کے سلسلہ میں رہن تھا، ایک خستہ سا مکان، تھوڑی بہت جمع پونجی تھی، وہ کاروبار میں لگی ہوئی تھی، کس کس پر کتنی رقم باقی ہے، یہ صرف ساجد میاں جانتے تھے، یا اللہ میاں، اس معاملہ میں ان کا کوئی ہمراز نہیں تھا، وہ جسے قرض دیتے تھے، اس کا ذکر اپنی بیوی تک سے نہیں کرتے تھے لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ مرتے ہی ان کی رقم بھی ڈوب گئی، ایسا ایماندار کون تھا جو خود سے آکر حساب بیباق کر جاتا، ہاں ساجد میاں کے ایک جگری دوست شیخ سلار تھے، جن سے ان کا لین دین ہوتا رہتا تھا، وفات کے دوسرے دن وہ آئے اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سو روپے انھوں نے آمنہ بی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ یہ رقم ساجد میاں نے شیخ صاحب کے پاس امانت

رکھوائی تھی آمنہ بی کو یہ تنو روپے بہت بڑی دولت معلوم ہوئے۔ اس سے انھوں نے اپنے مرحوم شوہر کا فاتحہ درود کیا اور جتنا ثواب مرنے والے کو پہنچا سکتی تھیں پہنچا دیا۔

اس کار خیر سے فارغ ہو کر گھر کی حالت کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دو وقت کی روٹی چلنا بھی مشکل ہے، باغ سے کوئی آمدنی نہیں ہو سکتی، کھیت لامحالہ بٹائی پر دینا پڑے گا، چونکہ جوتنے بونے کا کام وہ خود کر نہیں سکتی تھیں۔ لہذا اس سے اتنا غلہ نہیں مل سکتا تھا جو سال بھر کو کافی ہو، پھر گھر کا اور برادری کا خرچ، کپڑے لتے کا خرچ، بیماری آزاری اور سب سے بڑھ کر نوشابہ سے ماسٹ میاں نے لاڈ پیار میں کافی خراج بنا دیا تھا۔ کپڑے بھی اچھے ہوں تیل پھلیل بھی ہو، سرمہ اور منجن بھی چاہیے۔ گوشت اگر دونوں وقت نہ ہو تو ایک وقت تو ضرور ہو، زیور اتنے نہ ہوں جتنے شیخ سلار دکی لڑکی رابعہ کے پاس تھے لیکن کچھ تو ہوں۔

نوشابہ اب سیانی ہو چکی تھی۔ وہ جوانی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی، ماں کی مامتا اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ اس اکلوتی اور پیاری لڑکی کا دل میلا ہو اور دوسروں کی لڑکیوں کو اور ان کے گہنے کو دیکھ کر اپنا جی مار کے رہے۔ ان کے پاس دولت ہوتی تو وہ سب نوشابہ کو خوش رکھنے میں صرف کر دیتیں، مگر ہاتھ تھے اور ان بوڑھے ہاتھوں میں کچھ نہ بھی تھا، وہ سینا پرونا اچھا جانتی تھیں پہلے خدمت خلق کے خیال سے گاؤں والوں کی فرمائشیں پوری کیا کرتی تھیں اب پیٹ بھرنے اور نوشابہ کے بناؤ سنگار کے لیے وہ باقاعدہ اجرت پر کام کرتی تھیں اور رات بھر جاگ کر دن بھر بے آرام رہ کر اپنے پیسے کھرے کرتی تھیں اور اتنی خوش ہوتی تھیں، جیسے انھیں کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو، ماں اولاد کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے

گاؤں کے لوگوں کی دلی ہمدردیاں اس تباہ حال خاندان کے ساتھ تھیں لیکن غریب لوگ لفظی ہمدردی کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ یہ خود روکھا سوکھا کر گزارہ کرتے تھے، آمنہ بی

کی کیا مدد کرتے اور جو کھاتے پیتے خوش حال لوگ تھے، ان کی سب سے بڑی ہمدردی یہ تھی کہ وہ آمنہ بی سے کپڑے سلوائیں اور سلائی کی اجرت ادا کریں۔ ساجد میاں کے گھر میں چولھا جلا یا نہیں، کھانا کھایا یا فاقے سے رات گزار دی گئی اسے سوچنے والے بہت کم لوگ تھے، جو سوچ سکتے تھے وہ کچھ قدرت نہیں رکھتے تھے، جو کچھ قدرت رکھتے تھے انھیں سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

نوشابہ کی عمر تو زیادہ نہیں تھی، ۱۳، ۱۴ سال کی عمر ہی کیا، لیکن وہ صورت حال کو سمجھنے لگی تھی، ماں سے محبت بھی بے حد کرتی تھی، اس لیے وقت کا بڑا حصہ ماں کا ہاتھ بٹانے میں صرف کرتی تھی، آمنہ بی اسے لاکھ روکتیں لیکن وہ رات گئے تک ان کا ساتھ دیتی رہتی تھی اور پھر تھک کر ان کے پہلو میں لیٹ کر خراٹے لینے لگتی۔

وہی نوشابہ جو ساجد میاں کی زندگی میں لالوں کی لال بنی رہتی تھی، اچھے سے اچھا کھاتی اور اچھے سے اچھا پہنتی تھی۔ اب جو مل جاتا، صبر شکر کر کے کھا لیتی، جو میسر آتا پہن لیتی ایک ہفتہ تک کپڑے بدلنے کی نوبت نہ آتی مگر ماں سے کچھ نہ کہتی، آمنہ کی دلجوئیوں اور خاطرداری محنت اور شفقت کے باوجود پہلے کی سی بات نہ پیدا ہو سکی، نوشابہ نے اپنے باپ کے سایہ میں رہ کر جو کھا لیا اور جو پہن لیا، وہ ماں کی دیدہ ریزی اور محنت مزدوری کے باوجود پھر نہ مل سکا آمنہ بی نوشابہ سے کچھ نہ کہتیں، رات کو جب سونے کے لیے لیٹتیں، پہلے جی بھر کے رو لیتیں، پھر سوتیں، ان کی لاعلمی میں بالکل یہی حال نوشابہ کا تھا، وہ بھی ماں سے کچھ نہ کہتی لیکن کم ایسا ہوتا کہ چپکے چپکے روئے بغیر وہ سو گئی ہو، اسے سب سے زیادہ رونا اپنی ماں کی مسلسل محنت پر آتا تھا، جنھیں وہ محنت کرنے سے کسی طرح نہیں روک سکتی تھی۔

زندگی کا ایک دور وہ تھا، جو ساجد میاں کی زندگی میں گزرا، دوسرا وہ جو اب گزر رہا تھا، ایک گزر چکا تھا، دوسرا گزر رہا تھا، وہ ایک خواب تھا یہ ایک حقیقت ہے

باب ۳

پہلی ملاقات

نوشابہ کے کھیت اور گھر کے کچھ فاصلہ پر ایک اسکول تھا، اس میں صرف امیروں اور رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے، اسکول سے ملا ہوا بورڈنگ تھا، دوسرے شہروں کے رہنے والے لڑکے اسی بورڈنگ میں رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اس اسکول میں پڑھنے والا ایک لڑکا مسعود اس کا پیچھا کرتا۔ وہ اگر چلتے چلتے رک جاتی تو وہ بھی کھڑا ہو جاتا، وہ چلنے لگتی تو اس کے قدم بھی بڑھنے لگتے نوشابہ جانتی تھی مسعود اس کا پیچھا کرتا ہے، وہ اس کے تعاقب سے گھبراتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا اور ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی اس کے بدن میں، وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ بدنام نہ ہو مسعود کو اس کا پیچھا کرتا ہوا کوئی دیکھ نہ لے، لیکن دل ہی دل میں یہ تمنا بھی پرورش پاتی رہتی تھی کہ میں اسی طرح چلتی رہوں، اور مسعود میرا تعاقب کرتا رہے، یہاں تک کہ وہ میرے قریب پہنچ جائے۔ مجھ سے میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری باتیں کرنے لگے اور مجھے چھیڑے، ہنسی مذاق کی باتیں کرے، میں آگے بڑھنا چاہوں تو میرا دامن پکڑ لے، میں اسکے ہاتھ جھٹک دوں تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں، پھر میں ترس کھا کر اس کے پاس بیٹھ جاؤں اور اس سے

ہولے ہولے باتیں کرنے لگوں جنھیں اس کے سوا، کوئی اور نہ سن پائے، پھر میں جانے کے لیے اٹھوں اور وہ مجھے اس وقت جانے دے جب کل پھر میں اس سے ملنے کا وعدہ کر لوں۔

اور واقعی ایک دن ایسا ہی ہوا۔ نوشابہ کا تعاقب کرتے کرتے مسعود اس کے قریب پہنچ گیا، نوشابہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پچھلی تمام باتیں بھول گئی۔ بھاگنے کے لیے اس نے اپنی رفتار اور تیز کردی، آخر ایک درخت کے پاس پہنچ کر مسعود نے اسے روک ہی لیا۔

وہ درد بھری آواز میں بولا۔

"کیا آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں؟"

"نہیں تو!"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی مسعود پھر سامنے آگیا۔

"پھر آپ بھاگ کیوں رہی ہیں؟"

"مجھے دیر ہو رہی ہے!

ذرا ٹھہریئے تو!"

نوشابہ نے سہم کر پوچھا

"کیوں؟"

"کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے؟"

وہ رک گئی۔

"کہیے!"

مسعود بالکل قریب آگیا اور اس نے نوشابہ کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا

"میں آپ سے محبت کرتا ہوں"

یہ سن کر نوشابہ کا کان جلنے لگا، اس کا دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگا جیسے وہ سینہ کی دیوار توڑ کر باہر نکل پڑے گا، اس سے کچھ جواب نہ دیا گیا، اس سے آگے بھی نہ بڑھا گیا، وہ کھڑی بھی نہ رہ سکی، اس کے پاؤں تھر تھرانے لگے اور وہ گم سم مسعود کا منہ دیکھنے لگی۔

مسعود نے ایک نظر نوشابہ پر ڈالی، اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور آپ؟"

نوشابہ نے کوئی جواب نہ دیا، کچھ دیر انتظار کر کے بولا

جواب دیجیئے، آپ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں یا نہیں ہ۔۔۔۔ بتائیے زندہ رہوں یا خودکشی کر لوں؟"

نوشابہ نے سہم کر کہا

"خودکشی؟"

وہ اطمینان سے بولا

"جی، خودکشی۔ میں کر سکتا ہوں، اگر کہیئے تو ابھی، اسی وقت۔۔۔۔۔۔۔"

یہ کہتے کہتے اس نے ایک بڑا سا چاقو جیب سے نکالا، اسے کھولا اور اپنے مضبوط پنجہ کی گرفت میں لے کر گردن کی طرف بڑھایا۔

نوشابہ نے دلدوز منظر دیکھ کر جلدی سے مسعود کا ہاتھ پکڑ لیا،

"خدا کے لیے! ایسا نہ کیجیے!"

آپ چاہتی ہیں میں زندہ رہوں؟"

"جی!"

تو جواب دیجیے، آپ بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں یا نہیں ؟"

وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اس نے اضطراب اور سراسیمگی، بلکہ بے بسی اور بے کسی کے لہجہ میں کہا:

"جی ۔۔؟"

"میں پوچھتا ہوں، آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں یا نہیں"

اس نے خوف و دہشت کے عالم میں جواب دیا:

"کرتی ہوں!"

مسعود نے چاقو بند کیا، اور جیب میں رکھ لیا، نوشابہ جلدی سے آگے بڑھ گئی

مسعود نے آہستہ سے کہا:

"کل اسی وقت یہیں ۔"

نوشابہ اس طرح کھڑی بھاگ رہی تھی جیسے سنسان جنگل میں کوئی کمزور دل کا آدمی بھوت دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو، وہ بھاگ رہی تھی، بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کر دیکھا، تو مسعود جا چکا تھا، اب اسے اطمینان ہوا، اور اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔

راستہ بھر مسعود کی صورت نوشابہ کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی، جب تک وہ پاس تھا وہ گھبرا رہی تھی، ڈر رہی تھی، سہمی ہوئی تھی جب وہ دور ہو گیا تو اس کا دل پھر تشنۂ جذبات بن گیا، پھر وہ اپنے اوپر ملامت کرنے لگی کہ بھاگی کیوں؟ کچھ دیر تک اور مسعود سے باتیں کیوں نہ کیں؟ ہمیشہ دل ہی دل میں جو کچھ وہ سوچا کرتی تھی آج جب وہ واقع ہو گیا، تو گھبرا گئی، عورت کا دل کمزور ہوتا ہے نا!

مسعود خوش خوش ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا، غلیل اس کے کاندھے پر رکھی تھی، وہ

کبوتر کا شکار کرنے اور اُسے ذبح کرنے کے لیے چاقو جیب میں رکھ کر ہوسٹل سے نکلا تھا، اسے کوئی کبوتر نہ ملا، البتہ فاختہ مل گئی، ویسی ہی خوبصورت. ویسی ہی نرم و نازک، ویسی ہی سادہ لوح اور معصوم، اُسے ذبح کرنے کے لیے چاقو کی ضرورت نہیں پڑی، اس کے بغیر وہ ذبح ہو گئی، اس کامیابی پر وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

آبادی سے ہٹ کر کھیتوں کے جھنڈ کے قریب مسعود کا اسکول تھا، وہ بمبئی کے بہت بڑے تاجر سیٹھ قاسم کا اکلوتا بیٹا تھا، وہاں بُری صحبت میں وہ بگڑا جا رہا تھا، لہذا اس نزہت گاہ میں بھیج دیا گیا، جہاں نہ شہر کی رنگینیاں تھیں، نہ بیہودگیاں، نہ اوباش دوستوں کا مجمع تھا، نہ بدمعاش مصاحبوں کا گروہ، نہ تھیٹر تھے، نہ سینما نہ اپالو بندر، نہ چوپاٹی، سیٹھ صاحب کا خیال تھا ماحول کی تبدیلی سے مسعود بدل جائے گا۔

نوشابہ کے والد کا جب انتقال ہوا تو آمنہ بی کے خاندانی کھیت شیخ سلامت کو بٹائی پر دیدیا جو مولوی ساجد علی کے جگری دوست تھے، ان کی لڑکی رابعہ نوشابہ کی سہیلی تھی، اسی سے ملنے وہ اکثر اس طرف آیا کرتی تھی اور انہی کھیتوں کا گشت فرصت کے اوقات میں مسعود میاں کرتے تھے، احتیاطاً کندھے پر غلیل اور جیب میں چاقو رکھ لیتے تھے کہ اگر کوئی شکار مل جائے تو ذبح کر کے اسے حلال کر دیں، ادھر کچھ دنوں سے ان کی نظر نوشابہ پر پڑی، اور اس کے شکار کا انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا، بہت دنوں سے تاک میں تھے آج کامیاب ہو گئے، اس وقت دو ہستیاں تھیں جو دنیا و مافیہا کے خیال سے بے نیاز ہو کر صرف ایک دوسری کو یاد کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھیں، ایک نوشابہ جس کے تصور کی دنیا، مسعود کی خوبصورت اور طرحدار شخصیت سے آباد تھی، دوسرا مسعود جس کی آنکھوں میں، جو طلعت نوشابہ کی تصویر بسی ہوئی تھی اور وہ عالم خیال میں اس سے باتیں کرتا، اور گنگناتا ہوا، ہوسٹل کی طرف بڑھ رہا تھا! ؎

باب ۴

شام کے دُھندلکے میں!

آج پھر نوشابہ بغیر کسی وجہ کے رابعہ کے ہاں جا رہی تھی، وہ بن سنور کے جا رہی تھی، ماں نے بنتے سنورتے دیکھا تو پوچھا،

"کہاں جا رہی ہو بیٹی؟"

"کہیں نہیں ذرا رابعہ کے ہاں!"

ماں اپنے کام میں لگ گئی اور نوشابہ کے قدم رابعہ کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ رابعہ حسب عادت بڑے تپاک اور اخلاق سے ملی، اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کہ آج نوشابہ کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی ہے، آج اس کی مسکراہٹ میں سادگی کے ساتھ رنگینی بھی ہے، آج اس کی باتوں میں بے تکلفی کے ساتھ چلبلا پن بھی ہے، رابعہ سے نہ رہا گیا، وہ بولی،

"ایک بات پوچھوں؟"

نوشابہ خواہ مخواہ پھول کی طرح کھل گئی اس نے جواب دیا،

"پوچھو!"

"تم آج بدلی بدلی سی کیوں دکھائی دیتی ہو، اتنی زیادہ خوش کیوں ہو؟"

وہ مسکرائی، شرمائی،

"اے واہ!"

"میں نہیں مانے گی، کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے!"

بات کیا ہوتی کچھ بھی نہیں!"

ٹھنڈی سانس بھر کر، رابعہ بولی۔

"نہ بتاؤ، چھپا لو، ہم تمہارے ہیں کون۔ غیر جو ٹھہرے!"

نوشابہ نے رابعہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں،

"تو اگر غیر ہے تو میرا اپنا کون ہے؟ گھر سے اٹھتی ہوں تیرے پاس آجاتی ہوں یہاں سے اٹھتی ہوں گھر چلی جاتی ہوں، تو میری بہن بھی ہے اور سہیلی بھی!"

"پھر کیوں چھپا رہی ہوں؟"

تو تو اچھی خاصی باؤلی ہے، چھپاؤں گی کیا، کوئی بات بھی ہو؟

"جب سے ساجد چچا مرے ہیں، آج پہلی مرتبہ میں تجھے اتنا خوش دیکھ رہی ہوں؟"

شام ہو چلی تھی، نوشابہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے کہا

"بہت دیر ہو گئی، جاتی ہوں — تو میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے، سچ کوئی بات نہیں ہے!"

رابعہ منہ دیکھتی رہ گئی، اور نوشابہ دوپٹہ کے دامن کو ٹھیک کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی،

تھوڑی دور چلی تھی کہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی، اسے اندیشہ تھا کہیں رابعہ تعاقب نہ کر رہی ہو، ٹوہ نہ لگا رہی ہو کہیں وہ میرے دل کا چور پکڑ نہ لے کہیں وہ میرا بھید نہ جان لے کہیں میں رسوا اور بدنام نہ ہو جاؤں، پھر تو میں رابعہ سے بھی آنکھیں چار نہیں کر پاؤں گی

یہی سوچتی اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی، نوشابہ ٹھیک اسی جگہ پہنچ گئی، جہاں کل اس سے اور مسعود سے مڈ بھیڑ ہوئی تھی، وہی جگہ تھی، وہی طاقت، مسعود اس کے انتظار میں درخت

سے ٹیک لگائے، شکاری لباس پہنے نواب زادہ بنا کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی نوشابہ سب کچھ بھول گئی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، نہ جانے کیوں، اس کے ہونٹ خشک ہو گئے، ایک دہشت سی، ایک خوف ساطاری ہو گیا اس پر مسعود کو دیکھ کر وہ جھک گئی، آنکھیں چار نہ کر سکی، ٹھہر نہ سکی، آگے بڑھ گئی مسعود سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ بڑھا، اور سامنے آکر کھڑا ہو گیا، نوشابہ نے ادھر اُدھر دیکھ کر بڑی سادگی اور سراسیمگی کے ساتھ کہا۔

"پھر آپ سامنے آکر کھڑے ہو گئے"

"ارے یہ کیا؟ کل کی باتیں بھول گئیں تم؟ کیا کیا قول و قرار ہوئے تھے، کچھ بھی یاد نہیں رہا؟"

نوشابہ چپ چاپ کھڑی رہی، جیسے ایک مجرم۔ مسعود نے کہا:

"میں خالی ہاتھ اس وقت بھی نہیں آیا ہوں، وہ شکاری چاقو میری جیب میں پھڑک رہا ہے، وہ آج بھی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے، اگر تم واقعی خون ناحق پر تلی ہو"

نوشابہ پھر سہم گئی، اس نے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا،

"چاقو آپ ہر وقت جیب میں کیوں رکھتے ہیں؟"

"اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے!"

"وہ تو کل ہو چکا!"

"یعنی؟"

"جو کچھ آپ کہلانا چاہتے تھے، میں کہہ چکی"

"ڈر سے یا دل سے؟"

"چاہے کوئی میری گردن پر رکھ دیتا تو بھی میں وہ نہ کہتی، جو آپ سے کہہ چکی ہوں۔"

نوشابہ کے ان الفاظ میں ایک عزم تھا، ایک قوت تھی، جسے مسعود نے پورے طور پر محسوس کیا، اس کی باچھیں کھل گئیں، اس نے کہا۔

"کتنا خوش قسمت ہوں میں، نوشابہ ـــ شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے کہ تمہارا نام مجھے کیسے معلوم ہوا؟ تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں ـــ تم نہیں جانتیں، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، ہر وقت تمہارا مکھڑا میری آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے، سچ کہنا، کیا تم بھی مجھے یاد کرتی ہو کبھی؟"

نوشابہ لاجونتی کی طرح لجا گئی، اس کی گردن اور زیادہ جھک گئی۔ اس کے خوبصورت اور رس بھرے گالوں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسعود نے بے تابی اور جوش کے عالم میں کہا،

"بتاؤ نوشابہ، کیا تم بھی کبھی یاد کرتی ہو مجھے؟ رات کے سناٹے ہیں، دن کی شورشیں ہیں، دوستوں کے مجمع ہیں، ہوسٹل کی تنہائی ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم مجھے یاد نہ آتی ہو یاد نہ آتی رہتی ہو!"

نوشابہ نے جواب اب بھی نہیں دیا، لیکن وہ محبت بھری نظروں سے بھانپ گیا اور بولا!

"یہ کافی نہیں ہے، میں پیامِ محبت کا جواب، محبت بھری نظروں سے نہیں محبت بھرے لفظوں میں سننا چاہتا ہوں!"

نوشابہ نے کہا،

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، ہر گھڑی آپ مجھے یاد آتے رہتے ہیں۔"

مسعود خوشی سے دیوانہ ہو کر اچھلنے لگا، اس نے ایک اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے نوشابہ کے شانے پکڑے، اور اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر بولا

"آج تم نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے نوشابہ، میں تمہارے وہ ہونٹ چوم لینا چاہتا

موں، جن سے میں نے یہ خوش خبری سنی ہے!

مسعود سے زیادہ نوشابہ کے ہونٹ چومنے کا حق اور کسے تھا؟ وہ ذرا بھی مزاحمت نہ کر سکی، وہ خاموش کھڑی رہی، اور مسعود ایک فاتح اور کشور کشا کی شان سے، اپنے عشق اور محبت کا خراج نوشابہ کے ہونٹوں سے وصول کرتا رہا۔

نوشابہ نے جنسی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے شیریں اور لذیذ ہونٹ مسعود کے قبضہ میں نہیں دیئے تھے، وہ ابھی تک اچھی طرح جنسی مفہوم کو سمجھتی بھی نہیں تھی، اس سے یہ سپردگی کا جرم اس لیے سرزد ہوا تھا کہ وہ اپنے محبوب اور عاشق کے والہانہ اظہار محبت کی تاب نہ لا سکی، اس نے کل ہی سے طے کر لیا تھا کہ اب وہ صرف اسی کی بن کر زندہ رہے گی، پھر جب محبت کی پوری بیتابی اور جوش کے پورے ابال کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، تو وہ اسے پیچھے کیسے دھکیل دیتی؟ مزاحمت کیسے کرتی؟ اس کا دل کیسے توڑتی؟ ہونٹوں کی سپردگی کا آغاز پوری معصومیت اور اطاعت کے ساتھ ہوا تھا لیکن فوراً ہی یہ آغاز ایک دوسری کیفیت کا آغاز بن گیا، جب تک مسعود کے ہونٹ، اس کے ہونٹوں سے نہیں ملے تھے، اس کی دیوانگی اور جوش کی ہمدردانہ پذیرائی کے سوا، اور کوئی جذبہ اپنے دل میں نہیں رکھتی تھی لیکن جب مل گئے تو ایک انگریزی فلم "جنگل پر سسز" کی ہیروئن کی طرح اس کا جی چاہا کہ اس کے ہونٹ چومے جاتے رہیں، بلکہ اسے گود میں بھی اٹھا لیا جائے کو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اس کے دل نے سوال کیا، یہ میرا محبوب اور عاشق، اپنے مضبوط بازوؤں کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتا، یہ مجھے گود میں اٹھا کیوں نہیں لیتا؟ یہ ہونٹوں کی سرحد سے گزر کر رخسار کی وادی میں قدم کیوں نہیں رکھتا؟ اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ لب و رخسار کی منزل آخری منزل نہیں ہے، عشق و محبت

کا قافلہ بلا خیز، یہاں صرف پڑاؤ کرتا ہوا دم لے کر آگے بڑھنا اور آخری منزل کی طرف چل کھڑا ہوتا ہے، آخری منزل کیا ہو سکتی ہے؟ اس کی لامعلوم اور غیر معروف، مبہم اور ناصاف کیفیت نوشابہ کے دل میں کھٹک رہی تھی، لیکن وہ ذرا بھی نہ جانتی تھی کہ وہ کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے، ہاں سالارِ قافلہ اگر اسے جھنجھوڑ کر آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتا، تو شاید اس کے قدم پیچھے نہ ہٹتے!

وہ اسی کشمکش میں گرفتار تھی کہ مسعود کی گرم گرم سانسوں کا کارواں، ہونٹوں کی حدیں توڑتا، آتش فشاں پہاڑ کے گرم گرم لاوے کی طرح بڑھتا اور پھیلتا ہوا رخسار کی وادی میں پہنچ گیا، نوشابہ کی آنکھیں بند تھیں، مسعود کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں!

لیکن بہت جلد نوشابہ کو یہ احساس ہوا کہ جو کچھ ہو رہا ہے کہیں قبل از وقت تو نہیں ہے؟ نامناسب تو نہیں ہے؟ جرم تو نہیں ہے؟ مجھے شرم کیوں آ رہی ہے؟ میں شرم سے کٹی کیوں جا رہی ہوں۔ مجھ پر خوف اور دہشت کیوں طاری ہے؟ یا میرے اللہ! میں کیا کروں؟ خود بخود ہاتھ مسعود کے سینے پر پہنچے، اور اسے آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف دھکیلنے لگے، وہ بھی اب ہوش میں آ گیا، بغیر کسی مزاحمت کے پسپا ہو گیا۔

اب نوشابہ نے آنکھیں کھولیں، لیکن ملا نہ سکی، اس کی نگاہِ شرم پھر جھک گئی، اس نے آہستہ سے کہا،

"بڑی دیر ہو گئی!"

وہ ایک جذبہ کے ساتھ بولا،

"اب تم جا سکتی ہو، لیکن کل پھر میں یہاں آؤں گا، اور میری آنکھیں تمہیں ڈھونڈیں گی۔"

نوشابہ نے کوئی جواب نہ دیا، اپنا ڈھلکا ہوا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی، پھر اس نے

آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی، اسے جاتا دیکھ کر مسعود نے کہا۔

”میں کل پھر آؤں گا“

نوشابہ پھر بڑھتی رہی،

”میں کل پھر تمہارا انتظار کروں گا!“

نوشابہ اب بھی چلے جا رہی تھی،

”تم مجھے مایوس تو نہ کرو گی؟“

ایک ہلکی سی شیریں آواز آئی،

”نہیں!“

اور شام کے دھندلکے میں نوشابہ اپنے گھر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی،

مسعود اپنے ہوسٹل کی طرف لپک رہا تھا، دونوں کو فکر لگی ہوئی تھی، بہت دیر ہو گئی، اگر جواب طلبی ہوئی تو صفائی کس طرح دی جائے گی؟ اور اگر کہیں کل باہر نکلنے پر کوئی قدغن لگا دی گئی، تو اس کا توڑ کس طرح کیا جائے گا!

دونوں سایے ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے، دونوں مخالف سمت کی طرف بڑھ رہے تھے، کل پھر ایک مرکز پر جمع ہونے کے لیے!

باب ۵

چاندنی

وہی جگہ تھی اور وہی وقت، مسعود اور نوشابہ میں باتیں ہو رہی تھیں مسعود نے پوچھا
"مرمت تو نہیں ہوئی کل تمھاری؟"

"مرمت کیوں ہوتی؟"

"دیر سے جو گھر پہنچی تھیں"

اس کا توڑ تو میں نے کر لیا تھا۔

"کیا ذرا ہم بھی تو سنیں"

"اماں سے میں نے کہہ دیا، رابعہ بیمار ہے، اور جب تک وہ بیمار ہے، میں روزانہ اسے دیکھنے جاؤں گی، اسی لیے تو آج بھی آ گئی، ورنہ وہ آنے دیتیں بھلا۔"

"رابعہ کون؟"

"ہے ہماری ایک سہیلی!"

"واقعی بیمار ہے؟"

"اے واہ خدا نہ کرے!"

"اگر تمھاری اماں اسے دیکھنے کسی دن پہنچ گئیں تو؟"

"وہ وہاں جاتی ہی نہیں!"

"پھر تمھیں کیوں جانے دیتی ہیں؟"

"ابا سے اور سلار و چچا سے دوستی جو تھی، میں تو انھیں چچا کہتی ہوں"

"پھر وہ خود کیوں نہیں جاتیں؟"

"چچی سے ان کی لڑائی ہے، آج سے نہیں ہمیشہ سے"

"اگر سلار و چچا کبھی پہنچ گئے تمھارے گھر، تب کیا ہوگا؟"

"جب بھی کچھ نہیں ہوگا!"

"کیوں؟"

"سلار و چچا کئی ہفتے سے بمبئی گئے ہیں اپنا علاج کرانے!"

"ٹھیک ہے، پھر واقعی راوی چین ہی چین لکھتا ہے لیکن یہ تو بتاؤ!"

"کیا؟"

"رابعہ جب اچھی ہو جائے گی، تب کیا ہوگا؟"

"ادھر اس کی ابھی کیا فکر؟ ابھی تو وہ کئی ہفتے بیمار رہے گی، پھر دیکھا جائے گا"

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

مسعود نے ادھر اُدھر دیکھا؛ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا، آسمان پر چاند چمک رہا تھا، کھیتوں پر میدان پر، درختوں پر چاندنی نے ایک عجیب نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس نے کہا

"کتنا پیارا سماں ہے!"

وہ بولی"

"ہاں، بہت!"

"وہ سامنے تالاب ہے چلو وہاں چلیں"

"نہیں، یہیں ٹھیک ہے"

"کہنا تو مانو، وہاں بڑا مزا رہے گا!"

"بہت دیر ہو گئی اب کل!"

"کہہ دینا رابعہ کی حالت بڑی نازک ہو گئی تھی!"

مسعود نے نوشابہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا، وہ مزاحمت نہ کر سکی، دونوں تالاب پر پہنچے، اور منڈیر پر پاس پاس بیٹھ گئے،

مسعود کچھ دیر تک تالاب کے صاف شفاف پانی کو دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک نظر نوشابہ پر ڈالی، پھر آہستگی اور پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گویا ہوا،

"اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"کس طرح؟"

"یہی چھپ چھپ کے ملنا، اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے، تسلی نہیں ہوتی!"

نوشابہ بھی سوچنے لگی، سوچتے سوچتے اس نے تالاب کی سطح پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"پھر"

"یہی تو سوال ہے؟"

"آپ بتائیے کیا کیا جائے؟"

"تمھاری والدہ تک کسی طرح میری رسائی نہیں ہو سکتی؟"

"کیا فائدہ؟"

"وہ ان تک اگر میری پہنچ ہو جائے تو میں انھیں رام کر لوں گا، اور پھر ہم تم زیادہ

اطمینان اور آزادی کے ساتھ مل سکیں گے!"
کچھ دیر نوشابہ سوچتی رہی، پھر بولی،
"ایک صورت ہے"
"جلدی بتاؤ؟"
"واہ ری جلدی، جائیے نہیں بتاتے!"
"اونھ، شرارت پھر کر لینا، ہاں بتاؤ؟"
نوشابہ نے ایک کنکری تالاب میں پھینکی، پانی کے اندر دائرے بننے اور بگڑنے لگے، وہ انھیں غور سے دیکھنے لگی، پھر اس نے کہا
"دیکھئے کیسا دلچسپ کھیل ہے!"
یہ کہہ کر اس نے پھر ایک کنکری پھینکی،
مسعود نے بے دلی کے ساتھ پانی کے بے ہنگم دائروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"چھوڑو بھی ان بے کار باتوں کو، وہ ترکیب بتاؤ!"
نوشابہ ہنسنے لگی، اس نے کہا،
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، میں یونہی مذاق کر رہی تھی!"
"دماغ لڑاؤ، سوچو کچھ! ـــ اچھا ایک ترکیب میرے دماغ میں آئی ہے!"
"بتلائیے کیا ہے وہ ترکیب؟"
"کل میں کسی نہ کسی بہانہ سے ان کے پاس آتا ہوں، دیکھنا چند ہی ملاقاتوں میں کیسا شیشہ میں اتار لیتا ہوں انھیں!"
"لیکن آپ آئیں گے کیسے؟"

"اسے مجھ پر چھوڑ دو"

لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا!"

وہ کیا؟"

اماں کے سامنے مجھے گھور گھور کر نہ دیکھیے گا"

"تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتی ہو؟"

"آپ اپنی عادت سے مجبور جو ہیں!"

مسعود ہنسنے لگا، اس نے نوشابہ کا ہاتھ زور سے دبایا اور اسے اپنے سینہ پر رکھ کر بولا،

"ہاں مجبور ہوں عادت سے نہیں دل سے!"

نوشابہ اٹھ کھڑی ہوئی،

"اب جانے دیجئے، رات بڑھتی جا رہی ہے!"

"لیکن رابعہ موت کی ہچکیاں لے رہی تھی، تم کیسے اٹھتیں اس کے پاس سے؟"

نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"ہائے توبہ، خدا نہ کرے، آپ کے منہ خاک!"

"خفا کیوں ہوتی ہو اپنی بہن کے لیے، اس کی جگہ مجھے سمجھ لو!"

نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولی،

"وہ دن دیکھنے کے لیے خدا مجھے زندہ نہ رکھے"

مسعود بھی کھڑا ہو گیا، اس نے نوشابہ کے دونوں گالوں کو اپنی ہتھیلی کے شکنجہ میں جکڑ کر، اس کا منہ اوپر اٹھایا اور لب و رخسار پر محبت کی مہریں چسپاں

کرنے لگا۔

نوشابہ نے جلدی سے اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے دھکیلا اور اپنے بالوں کی لٹیں درست کرتے ہوئے ذرا خفگی کے لہجہ میں بولی،

"بس انہی باتوں سے مجھے چڑ ہے!"

مسعود نوشابہ کے اور قریب آگیا، اس نے شرارت بھرے لہجہ میں کہا،

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہمیں غصہ پہ پیار آتا ہے

نوشابہ مسکرا دی مسعود ہنسنے لگا، اور پھر دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے، ایک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، اور دوسرا انشاط خاطر کے ساتھ

باب ۶

آمنا سامنا

مسعود بڑا جیالا آدمی تھا، وہ ایسی باتیں کر گزرتا تھا جن کا دوسرا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جس سے چاہے دوستی کرے، جس اجنبی سے چاہے راہ و رسم پیدا کرلے، جہاں مرضی ہو پہنچ جائے، اور اس طرح پہنچے کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے، اپنے ہم سبق طالب علموں پر اپنے منچلے پن کی اس نے دھاک بٹھا رکھی تھی، وہ مالدار باپ کا بیٹا تھا، لیکن غریبوں میں غریب اور امیروں میں امیر بن جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، ناٹک اور فلم کی دنیا سے وہ دور تھا لیکن حسب ضرورت ایسی اداکاری کرتا کہ جو چاہتا تھا وہ دوسروں کو باور کرا دیتا تھا، وہ جب چاہتا تھا ہوسٹل سے غائب ہو جاتا تھا لیکن ٹیوٹر کی تادیب سے ہمیشہ محفوظ رہا، اس لیے نہیں کہ وہ ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ تھا، صرف اس لیے کہ وہ ایسے گھڑے ہوئے عذر پیش کرتا تھا کہ ٹیوٹر کے لیے خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ کبھی کبھی دن درجہ سے غیر حاضر رہتا تھا، لیکن معلم سے اپنی غیر حاضری کے اسباب ایسے پیرایے میں بیان کرتا تھا کہ اگر مزید ایک ہفتہ غیر حاضر رہنا چاہتا تو رہ سکتا تھا، قاسم سیٹھ بڑے گھاگ تھے، دنیا دیکھے ہوئے اور دنیا والوں کو اپنی انگلیوں پر نچائے ہوئے، لیکن مسعود اس صفائی سے انھیں قائل کرتا تھا کہ وہ کبھی اس کی فضول خرچی پر احتجاج

اور اس کے دوستوں پر دل کے سوا زبان سے تنقید نہ کر سکے، باپ کو اس نے باور کرا دیا تھا کہ وہ دن رات محنت کرتا ہے۔ دن کو کھیلتا نہیں، رات کو آرام نہیں کرتا لیکن جب سال بھر کے بعد، امتحان کا نتیجہ نکلا، اور وہ تقریباً تمام مضامین میں فیل ہوا، تو ناکامی کا تاج اپنے سر سے اتار کر پرنسپل کے سر پر اس خوبی سے رکھا کہ باپ نے خود اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے، پرنسپل صاحب کو ان کی غیبت میں وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ اگر وہ موجود ہوتے تو شاید نوبت فوجداری تک پہنچ جاتی، اس مرحلہ پر مسعود چاہتا تو بڑی آسانی سے قطع تعلق کر سکتا تھا اور بمبئی کی رنگینیوں میں مشغول رہ سکتا تھا، لیکن اس کی نظر نوشابہ پر پڑ چکی تھی لہذا بجائے اس کے کہ باپ ڈانٹ ڈپٹ کر اسکول واپس بھیجتا، صورت یہ تھی کہ پدر بزرگوار صاحبزادے کو اسکول بھیجنے سے صاف انکار کر رہے تھے، اور صاحبزادے باپ کو منا رہے تھے کہ جب تک میں ناکامی کا داغ کامیابی کے پانی سے نہ دھولوں اسکول سے قطع تعلق نہیں کر سکتا۔

آخر بڑی کشمکش کے بعد وہ مدرسہ پھر آیا اور آتے ہی اپنے کام میں منہمک ہو گیا اسکول کے وقت وہ شکار کرتا تھا، ہوسٹل کی حاضری کے وقت کھیتوں اور میدانوں کی سیر کرتا تھا اور سیر و تفریح کے وقت وہ کسی درخت کے نیچے یا تالاب کے کنارے بھولی بھالی نوشابہ کو اسیرِ دام کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

کل اس نے وعدہ کیا تھا، کہ اس کے گھر پہنچے گا، آج جب اسکول کی گھنٹی بجی تو وہ ہوسٹل سے مدرسہ جانے کے بجائے، آمنہ بی کے گھر کی طرف چل پڑا، وہ پورے سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دروازہ پر پہنچا اور دستک دی، آمنہ بی، فوراً دروازہ پر آئیں، انھوں نے مسعود کو دیکھا اور پوچھا،

"بیٹا کس سے ملنا ہے تمھیں؟"

مسعود نے ادب سے پہلے تو آمنہ بی کو سلام کیا، پھر دریافت کیا،

"ساجد چچا کا گھر یہی ہے؟ ——— میں ان سے ملنے آیا ہوں بمبئی سے، وہ بمبئی جاتے تھے ہمارے گھر ٹھہرا کرتے تھے، اِدھر بہت دنوں سے نہ خود آئے، نہ کوئی خط گیا میرا داخلہ یہیں کے اسکول میں ہوا ہے، ابا نے تاکید کردی تھی، ہوسٹل میں سامان رکھنے کے بعد، سب سے پہلے ساجد چچا سے ملنا!"

آمنہ بی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، انھوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بیٹا اب وہ اس دنیا میں کہاں؟ آؤ اندر آجاؤ!"

مسعود ان کے ساتھ ساتھ اندر پہنچا، آمنہ بی، ساجد میاں کا ذکر کر کر رونے لگیں مسعود کی بھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، نوشابہ سامنے بیٹھی تھی، اور دل ہی دل میں ہنسی کے مارے دیوانی ہوئی جا رہی تھی، باپ کا جب ذکر آجاتا، تو وہ ہمیشہ رونے میں ماں کا ساتھ دیتی تھی لیکن آج مسعود کے ایکٹ کو دیکھ کر اس کے لیے ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا

آمنہ بی نے مسعود سے مزید پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ ہمارے گھر میں تو ساجد چچا سے کوئی پردہ نہیں کرتا تھا، سب ان کے سامنے آتے تھے، بالکل عزیزداری کا معاملہ تھا، اسی لیے تو میں ہمیشہ انھیں چچا کہا کرتا تھا، آمنہ بی کی شفقت یہ اپنائیت کی باتیں سن کر اور بڑھ گئی، انھوں نے نوشابہ سے کہا، میرا بچہ اتنی دیر سے بیٹھا ہوا ہے، تم نے اس کی خاطر مدارات بھی نہ کی، نوشابہ چائے بنانے کے لیے اُٹھی لیکن مسعود نے منع کر دیا اس نے کہا اس وقت تو کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا، کوئی تکلف تو ہے نہیں، اپنا گھر ہے، میں تو روز ہی آیا کروں گا، پھر کسی دن سہی، اب مسعود نے نوشابہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا،

"نوشابہ بھی ہیں؟"

"ہاں بیٹا!"

ساجد چچا جب ہمارے ہاں آتے تھے تو ان کا بڑی محبت سے ذکر کیا کرتے تھے اسی لیے تو دیکھیے ان کا نام بھی مجھے یاد رہ گیا ــــــــ یہ کچھ پڑھتی لکھتی بھی ہیں؟"

ہاں اسکول میں پڑھتی تو ہے لیکن کوئی بڑا اسکول تو ہے نہیں، یونہی جدید پڑھائی ہوتی ہے۔"

"چچی اب زمانہ بدل چکا ہے، بہت آگے نکل چکا ہے، اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم بہت ضروری ہے، اور خصوصاً بغیر انگریزی کے تو کام نہیں چل سکتا، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں انگریزی پڑھا دیا کروں، یہ مجھ سے کئی برس چھوٹی ہیں، چچا حساب لگا کے بتایا کرتے تھے، میں ان سے چھ برس بڑا ہوں، پھر مجھ سے کیا شرمائیں گی ــــــــ کیوں نوشابہ پڑھو گی انگریزی مجھ سے؟"

نوشابہ نے شرما کر گردن جھکا لی، آمنہ بی اب تک پس و پیش میں تھیں، انھوں نے کہا "بیٹا تم پڑھنے آئے ہو، اس بے چاری کو کیا پڑھاؤ گے؟"

"یہ لیجیے کیوں نہیں پڑھاؤں گا، آپ کو شاید یہ فکر ہے کہ میرا حرج نہ ہو!"

"ہاں اور کیا!"

"بالکل فکر نہ کیجیے اس کی!"

"کیسے نہ کروں بیٹا؟"

میں کہتا ہوں نہ کیجیے، آپ کو نہیں معلوم اگر میں انھیں پڑھاؤں گا تو میری قابلیت بھی تو بڑھے گی، چچا کہا کرتے تھے، میں نوشابہ کو انگریزی ضرور پڑھاؤں گا، میں تو ان کی

وصیت سمجھ کر نوشابہ کو انگریزی سکھاؤں گا!"

آمنہ بی چپ ہوگئیں، مسعود نے گفتگو کا رُخ بدل کر کہا،

"اچھا اب اجازت دیجئے!"

"جاؤ بیٹا لیکن کبھی کبھی اِدھر بھی ایک پھیرا لگا لیا کرو"

"ضرور ضرور، چچی آپ پھیرا لگانے کو کیا کہہ رہی ہیں، میں تو ایک چکر روز لگا کروں گا، باہر آنے جانے کا یا سودا سلف خریدنے کا کام ہو وہ بھی مجھے بتا دیا کیجیے میں اسے بڑی خوشی سے کروں گا، یہ میرے چچا کا گھر ہے، میں ان کی یتیم بچی اور غم زدہ بیوہ کا سہارا بن کر رہوں گا یہاں، آج چچا زندہ ہوتے تو وہ مجھے اپنا دست و باز سمجھتے! آپ کو نہیں معلوم وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے!"

"بیٹے تمھاری ان شرافت کی باتوں نے واقعی مجھ دکھیاری کو سہارا دیدیا، ہمار اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، تمھاری یہ محبت بھری باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے ہم اکیلے نہیں ہیں، ہمارا بھی کوئی ہے اس جہاں میں!"

مسعود جانے کے لیے اٹھا، اور جاتے جاتے اُس نے دو سو روپے کے نوٹ جیب سے نکال کر، آمنہ بی کے ہاتھ پر رکھ دیئے، وہ اچنبھے سے بولیں۔

"یہ کیا بیٹا؟"

"چچی مجھے تو کچھ معلوم نہیں، ابا نے چلتے وقت یہ روپے دیئے تھے اور کہا تھا ساجد بھائی کو دے دینا اور ان سے کہہ دینا، اس وقت یہ روپے بھیجتا ہوں، باقی حساب کر کے، آئندہ کسی وقت بھیجدوں گا، ہوگا ان دونوں کا حساب کتاب کچھ!"

آمنہ بی نے شکر و سپاس کی نظروں سے مسعود کو دیکھ کر روپے اپنے قبضہ میں

کر لیے، مسعود نے انھیں ادب سے جھک کر سلام کیا اور کل آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا،
اس کے جانے کے بعد ماں نے بیٹی سے کہا،

"کتنا نیک اور شریف لڑکا ہے!"

نوشابہ بولی،

"اماں میں تو انگریزی پڑھوں گی!"

ماں نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا،

"تو میں کب منع کرتی ہوں بیٹی!"

نوشابہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا، آمنہ بی کے منہ پر بھی اس وقت رونق کا نور برس رہا تھا، شوہر کی بیماری اور موت میں گھر کا ایک ایک برتن بک گیا تھا، ان دو سو روپوں سے دو ہزار کام نکل سکتے تھے!

باب ۷

میل جول

مسعود اب اکثر آمنہ کے گھر آیا کرتا تھا اور گھنٹوں، پہروں بیٹھتا، اس کی سعادت اور خدمت نے، آمنہ کا دل موہ لیا تھا، اس کی دلچسپ اور شوخ باتوں نے نوشابہ کو اسیر کر لیا تھا، آمنہ بی، اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں کہ خدا نے مسعود کی صورت میں انھیں پلا پلایا لڑکا دیدیا، اور نوشابہ فخر سے پھولی نہیں سماتی تھی، مسعود جیسا البیلا چھیل جوان اس پر ہزار جان سے فدا تھا، اسے اس طرح تکا کرتا تھا جیسے کئی دن کا بھوکا، پلاؤ زردہ کے خوان کو للچائی ہوئی نظروں سے تکتا ہے۔

نوشابہ اور مسعود کے میل جول کو دیکھ کر پڑوس کے لوگوں نے اعتراض کیا، دور کے عزیزوں نے طعنے دیے، لیکن اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ ان مخالفتوں کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا، آمنہ بی ہر مخالف کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیتی تھیں، کچھ بھی ہو، ہم مسعود کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم نے دیکھ لیا، "ان کے مرنے کے بعد عزیزوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا، کوئی کٹی انگلی پر پانی بہانے کا بھی روادار نہیں، اور ایک وہ بیچارہ ہے کہ اپنے منہ بولے چچا مرحوم کی لڑکی اور بیوی کے لیے اسکول چھوڑ چھاڑ کر آتا ہے، کوئی بیمار پڑے تو دوا دارو کا بندوبست کرتا ہے، کوئی ضرورت ہو تو سودا سلف بھی لا دیتا

ہے، اپنی کوکھ کا لڑکا ہوتا وہ بھی زیادہ سے زیادہ وہی کرتا جو مسعود کر رہا ہے، لوگوں کی
کیا وہ جلتے ہیں، وہ تو چاہتے ہیں یہ بڑھیا یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے اور اس کے
حلق میں کوئی پانی بھی نہ ٹپکائے، نا بابا کچھ بھی ہو جائے، میں اپنے بچہ کو نہیں چھوڑ سکتی
وہ میرے لیے اولاد سے بڑھ کر ہے، دنیا چھوٹ جائے، وہ نہیں چھوٹ سکتا، ہرگز
نہیں چھوٹ سکتا۔

آمنہ بی کو مسعود پر اتنا ہی اعتماد اور بھروسہ تھا جتنا اولاد پر ہوتا ہے، وہ دل
ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھیں مسعود میرا لڑکا ہے، نوشابہ میری لڑکی ہے۔

ان دونوں کے ملنے جلنے ہنسی دل لگی، بات چیت کو دوسرے چاہے جس رنگ میں
دیکھیں لیکن وہ بھائی بہن کے رنگ میں دیکھتی تھیں نوشابہ مسعود سے کھل کر باتیں کرتی تھی،
کھیت تک یا شیخ سالار و کے ہاں جانا ہوتا تو بے تکلف آمنہ بی نوشابہ کو مسعود کے ہمراہ
بھیج دیتیں، وہ نوشابہ کا مسعود کو حامی و مددگار اور محافظ سمجھتی تھیں، اب تو انھوں نے
یہ معمول بنا لیا تھا کہ نوشابہ کو اکیلا کہیں نہیں جانے دیتی تھیں، ضروری تھا کہ وہ اس کے
ساتھ جائے، اگر مسعود کی کبھی طبیعت خراب ہوتی، تو وہ ہوٹل سے دو چار روز کے لیے
آمنہ بی کے ہاں آجاتا، اور یہاں خوب مہمان داری اور تیمارداری کے مزے لوٹتا،
آمنہ بی اس کے لیے اچھے کھانے پکاتیں اور نوشابہ ہمہ وقت تیمارداری کے لیے اس کی
پٹی سے لگی بیٹھی رہتی، جب آمنہ بی آجاتیں، وہ کراہنے لگتا، جب وہ کسی کام سے باہر
چلی جاتیں، یا پکانے رندھنے میں مصروف ہو جاتیں، تو دونوں گھل مل کر باتیں کرنے
لگتے، وہی محبت اور چاہ کی باتیں، وہی ہجر و وصال کے قصے، وہی عشق اور بینائی کا
اظہار، وہی شرم اور سپردگی کی کیفیت،

آمنہ بی نے اپنے شوہر سے مسعود کا، یا اس کے باپ کا ذکر نہیں سنا تھا، شاید اس لیے کہ وہ "باہر کی باتیں گھر میں کرنے کے عادی ہی نہیں تھے۔ ساجد میاں نے اپنے کسی حساب کتاب کا ذکر بھی آمنہ بی سے کبھی نہیں کیا تھا، شاید اس لیے کہ وہ انھیں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ محرم راز بنائیں لیکن مسعود کے باپ کو وہ اپنے حقیقی دیور سے بھی زیادہ اس لیے سمجھنے لگیں تھیں، کہ اگر حقیقی دیور ہوتا تو شاید وہ بھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اور یہ جان کر کہ بیوی بچی کو کچھ نہیں معلوم حساب کتاب کا ذکر گول کر جاتا، مگر ایک مسعود کا باپ منہ بولا دیور تھا، جو بے پوچھ کچھ کے ہر تیسرے، چھٹے مہینے ڈیڑھ دو سو کی رقم اپنے بیٹے کے ہاتھ بھیج دیا کرتا تھا، مسعود کو حقیقی بیٹا وہ یوں سمجھنے لگی تھیں کہ آج کل کے سگے لڑکے بھی ماں کی اتنی عزت اور خدمت نہیں کرتے، جتنی مسعود کرتا ہے۔

غرض اعتماد و اعتبار اور شفقت و محبت کا ایک ایسا دور تھا، جس کا حاتمانہ فیاضی کے ساتھ آمنہ بھی اسراف کر رہی تھیں اور جس سے مسعود پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا، آمنہ بی نوشابہ کی بڑی کڑی نگرانی کرتی تھیں لیکن مسعود کے معاملہ میں انھوں نے ڈھیل دے رکھی تھی انھیں جتنا اعتماد نوشابہ پر تھا، اس سے کہیں زیادہ مسعود پر تھا، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا تصوّر نہیں کر سکتی تھیں کہ نوشابہ کے پاؤں پھسل سکتے ہیں یا مسعود کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔

ایک روز آمنہ بی بیٹھی ہوئی کھانا پکا رہی تھیں اور مسعود دوسرے گوشہ میں بیٹھا نوشابہ کو انگریزی پڑھا رہا تھا کہ شیخ سلار آئے، وہ عرصہ سے مسعود کے بارے میں آمنہ بی سے گفتگو کرنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن مصروفیتوں کے سبب آ نہیں سکتے تھے، آج انھیں موقع ملا، اور وہ آ ہی گئے، انھوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ مسعود ہے، اور نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اُس سے مخاطب نہ ہوئے اور ترچھی نظروں سے گھورتے ہوئے

آمنہ بی کے پاس چلے گئے۔
مسعود ان کی غضبناک آنکھیں دیکھ کر سہم گیا اور درسِ محبت ناتمام چھوڑ کر کھسک گیا
شیخ صاحب نے آمنہ بی سے ذرا خفگی کے لہجہ میں پوچھا،

"مسعود یہی ہے؟"

وہ پیاز کترتے کترتے بولیں،

"ہاں یہی ہے!"

"یہی نوشابہ کو انگریزی پڑھاتا ہے؟"

"ہاں!"

"کون ہے یہ؟"

"بمبئی میں "اُن" کے کوئی دوست رہتے ہیں انہی کا لڑکا ہے!"

"کون دوست؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی، یہ ضرور جانتی ہوں کہ کبھی کبھی وہ بمبئی جایا کرتے تھے۔"

"اتنا تو میں بھی جانتا ہوں لیکن ساجد بھائی کا وہاں کوئی دوست بھی تھا اسے میں نہیں جانتا"

"تو بھیا تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"یہ لونڈا جھوٹا ہے!"

آمنہ بی نے چھری ہاتھ میں لیے لیے پیاز کو ذرا پرے ہٹا کر، سنجیدہ لہجہ میں کہا،

"جھوٹ بولنے سے اسے غرض؟"

"میرا دل کہتا ہے!"

"تم ہمیشہ کے سنکی ہو ــــ اے میں کہتی ہوں خود ہی سوچو، جھوٹ بولتا ہے آدمی

کسی فائدہ کے لیے، اس کا مجھ سے کیا بھلا ہو سکتا ہے؛ اُلٹا وہ خود بیچارہ، نوشابہ کے باپ کے حساب کتاب کی کچھ نہ کچھ رقم ہر تیسرے چوتھے مہینے دے جاتا ہے، کوئی جھوٹا آدمی اپنی جیب سے سینکڑوں روپے خرچ نہیں کر سکتا، پھر یہ بھی سوچو، اُسے میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؛ نوشابہ کا نام اُس نے کیسے جانا؛ نوشابہ کے باپ کی موت خبر سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا کیوں؟ ــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، تمھیں خواہ مخواہ شبہ ہوا کرتا ہے، لوح تمھارے ایسا کوئی شکی ہو!"

شیخ صاحب، ان باتوں سے کچھ قائل ہوئے، کچھ شرمندہ ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر چلے گئے، ہمیشہ جب آتے تھے، تو آمنہ بی تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے پان کے بیڑے پیش کیا کرتی تھیں لیکن آج مسعود کے بارے میں ان کے شک و شبہ کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں اتنی خفا تھیں کہ ایک دفعہ بھی شیخ صاحب کو پان کے لیے نہیں پوچھا، انھوں نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی باتیں آمنہ بی بری لگی ہیں اسی لیے وہ جلدی سے اُٹھ گئے، اور جب گھر سے باہر نکلے تو دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب مسعود اور نوشابہ کے بارے میں وہ کچھ نہیں بولیں گے، اور حتی الامکان اس گھر میں آئیں گے بھی نہیں، وہ نوشابہ کو اولاد کی طرح چاہتے تھے، آمنہ بی کا بہن کی طرح خیال رکھتے تھے ساجد میاں کے انتقال کے بعد اس ساری بستی میں وہی ایک تھے، جو حسب موقع دامے درمے خبر لیا کرتے تھے، ان جیسے ہمدم اور دوست سے بھی، آمنہ بی ایک غیر آدمی کے لیے خفا ہو سکتی ہیں، اس کا انھیں صدمہ بھی تھا اور غصہ بھی، اس گھر میں کبھی نہ آنے اور یہاں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ انھوں نے اسی لیے کیا تھا۔

باب ۸

میلہ

ایک روز مسعود نوشابہ کو حسبِ معمول پڑھا رہا تھا کہ وہ بولی،

"کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟

"کیا ہوا؟"

"بسنت پور کا میلہ ——— ہم تو کل وہاں جا رہے ہیں! رابعہ بھی جائے گی!
اور بھی بہت سی سہیلیاں ہوں گی!"

"واللہ تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی، میں بھی ضرور چلوں گا!"

"آپ بھی چلیں گے؟

"ہاں ہاں کیوں؟"

"کس کے ساتھ؟"

"تمہارے ساتھ!"

واہ یہ نہیں ہو سکتا"

"وجہ؟"

"ہمارے ساتھ تو رابعہ ہو گی!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، وہ بھی سہی، ایک نہ شُد دو شُد!"

"نوشابہ مسکرائی"

"پھر وہی شرارت!"

"اس میں شرارت کی کیا بات ہے؟ ہم بھی دیکھیں گے میلہ"

"دیکھئے، لیکن ہمارے ساتھ نہیں"

"یہ مناہی کیوں؟"

"آپ تو بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں، بھلا ہمارے ساتھ کیسے چلیئے گا، دنیا کیا کہے گی، یہاں آپ کا آنا اور بات ہے اور لڑکیوں کے ساتھ جانا دوسری بات ہے اماں مان بھی لیں لیکن سلار و چچا کیوں جانے دیں گے بھلا رابعہ کو آپ کے ساتھ!"

مسعود سر کھجانے لگا،

"پھر؟"

"پھر کیا، آپ کو جانا ہو تو الگ سے جایئے!"

"یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن تم وہاں کیسے ملو گی؟"

"میلہ میں کچھ گھر بیٹھنا تو ہے نہیں، پھرتے پھراتے مل جائیں گے کہیں نہ کہیں!"

"بہت خوب آپ تشریف لے جایئے، ہم بھی وہاں دیدار حاصل کرنے حاضر ہوتے ہیں"

"بس تو اب پڑھائی ختم، انتظام کرنا ہے سفر کا!"

"اوہو بڑا سفر، کتنی دور ہے یہاں سے تمہارا نسبت پور؟"

"ہو گا کوئی پانچ چھ کوس"

نوشابہ نے کتاب بند کر دی اور اٹھ کھڑی ہوئی، مسعود نے ہیٹ سر پر رکھا، اور

چل کھڑا ہوا،

بسنت پور کا سالانہ میلہ بڑی دھوم دھام سے لگتا تھا، آس پاس کی بستیوں اور دیہات سے لوگ اس میلہ میں شرکت کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے،

دوسرے روز ایک بیل گاڑی پر سوار ہو کر رابعہ تو نوشابہ کے گھر پہنچی، آتے ہی اس نے تقاضہ کیا،

"چلو!"

نوشابہ تیار بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی، فوراً اپنی پوٹلی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی

"چلو، میں تو کتنی دیر سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں، اب آئی ہیں رانی صاحبہ بن ٹھن کے"!

دونوں آکر گاڑی میں بیٹھ گئیں، جمعراتی گاڑی ہنکا رہا تھا، یہ شیخ سلارو کا خاندانی نوکر تھا، اس کے پہلو میں، شبراتن اور رفاتن اس کی بیوی اور لڑکی بیٹھی تھیں، اندر نوشابہ رابعہ، یہ دونوں پردہ نہیں کرتی تھیں لیکن گاڑی پر پردہ پڑا ہوا تھا، اور شیخ سلارو نے چلتے وقت جمعراتی کو تاکید کر دی تھی کہ "بے پردگی نہ ہونے پائے!" ہر سال یہاں سے بچوں، عورتوں، مردوں کے قافلے بسنت پور کے میلہ میں جاتے تھے، شیخ سلارو ذاتی بیل گاڑی میں، اپنی لڑکی (رابعہ) اور بھتیجی (نوشابہ) کو لے کر خود جایا کرتے تھے، اس دفعہ وہ نہ جاسکے تو گھر کے بوڑھے ملازم جمعراتی کی ہمراہی میں انھیں بھیج دیا، شیخ صاحب کی ایک چھوٹی سی چھولداری بھی ساتھ جاتی تھی، رات کو وہ اور ان کے متعلقین اسی میں رہتے تھے، اس مرتبہ بھی چھولداری ساتھ جا رہی تھی، شیخ صاحب کی قائم مقامی تین تین ہستیاں کر رہی تھیں، خود جمعراتی، اس کی بیوی اور لڑکی۔

گاڑی ہوے ہوے بسنت پور کی طرف بڑھ رہی تھی، جمعراتی بیلوں کو گالیاں دینے

میں مصروف تھا، تبسم اتن اونگھ رہی تھی، بقائن راستہ کے مناظر میں کھوئی ہوئی تھی، رابعہ اور نوشابہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر، راستہ کے ہچکولے سہتی ہوئی، اور کبھی کبھی ایک دوسرے کے سر سے سر لڑاتی ہوئی، باتوں میں مصروف تھیں،

رابعہ نے کہا،

"آج تو سولہ سنگار کر کے نکلی ہو گھر سے!"

نوشابہ مسکرائی،

"کہیں نظر نہ لگا دینا!"

"میں کیا نظر لگاؤں گی، ہاں مجھے یہ دھڑکا ضرور ہے کہ کہیں کوئی تم پر عاشق نہ ہو جائے میلہ میں!"

"تم ہی کیوں نہیں ہو جاتیں!"

"ہوں تو لیکن میں بیچاری کس گنتی میں ہوں، سنا ہے"

"ہاں ہاں کہو کیا سنا ہے؟"

"عشق و محبت کے پینگ خوب بڑھ رہے ہیں!"

"نوشابہ کا چہرہ یہ سن کر ایک مجرم کی طرح سفید پڑ گیا لیکن وہ سنبھلی،

"سنی سنائی باتوں کا کیا ذکر؟"

"ہم کانوں سنی نہیں کہتے، آنکھوں دیکھی کہتے ہیں!"

نوشابہ کی لویں تپنے لگیں، وہ گھبرا گئی لیکن پھر سنبھلی،

"ذرا ہم بھی سنیں!"

"سنا دوں گی سب کچھ!"

"تو کیا ہاتھ جڑاؤ گی کہتیں کیوں نہیں؟
"شرماجاؤ گی، ہٹو نہیں کہتے!"
اور واقعی نوشابہ چھوئی موئی درخت کی طرح لجاگئی، رابعہ نے پھر اُسے چھیڑا،
"مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا ——"
"اونھ، تو پاگل ہے!"
"مجھے پاگل کیوں کہتی ہو، اپنے دیوانہ کی خبر لو!"
"ہوش کی باتیں کرو پگلی، کیسا دیوانہ کس کا دیوانہ؟"
"مسعود!"
نوشابہ چپ ہوگئی، رابعہ سے آنکھیں چار نہ کرسکی لیکن رابعہ بھلا کب چپ ہونے والی تھی، اُس نے نوشابہ کا منہ اوپر کی طرف اٹھا کر کہا،
"ادھر دیکھو شرما کیوں رہی ہو؟"
"میں کیوں شرماؤں گی"
"ہاں اور کیا، بے غیرت جو ٹھہریں"
"تیری طرح!"
"تم نہیں مانو گی، سن ہی رہی ہو سب کچھ!"
نوشابہ پھر خاموش ہوگئی، اور رابعہ نے کہنا شروع کیا،
"وہ درخت —— وہ کھیت —— وہ تالاب —— وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پاس بیٹھنا، باتیں کرنا، اور —— اور —— ہائے اللہ، اب مجھ سے نہیں کہا جاتا!"
رابعہ نے زور سے نوشابہ کو گدگدایا، وہ پھیکی ہنسی ہنسنے لگی، دونوں بچپن کی سہیلیاں

تھیں، ایک دوسرے کی ہمدم و ہمراز، بے تکلف اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی
رابعہ نے اب کی نوشابہ کے ایک چٹکی لی، اور سرگوشی کے لہجہ میں کہا،

"اب بتا دو سچ سچ!"

"کیا؟ کیا بتاؤں!"

"محبت ہے یا نہیں؟"

نوشابہ پردہ سے منہ باہر نکال کر راستہ کے مناظر دیکھنے لگی، رابعہ نے پھر اسے
پکڑ کر اندر کھینچ لیا، اور کہا،

"بول"

"بول تو رہی ہوں"

"محبت ہے یا نہیں؟"

نوشابہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا،

"ہے!"

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی؟"

"ہاں!"

"پہلی کس کی طرف سے ہوئی تھی؟"

نوشابہ نے مسکرا کر رابعہ کی طرف دیکھا اور کہا

"آنکھوں کی طرف سے!"

"پھر وہی شرارت ـــــ اچھا یہ بتاؤ پہلی ملاقات کس طرح ہوئی، کہاں ہوئی تھی؟"

"چل ہٹ، نہیں بتاتے!"

نوشابہ نے پھر پردہ سے منہ باہر نکال لیا اور مناظر کا نظارہ کرنے لگی، رابعہ نے پھر اسے گھسیٹا،
آج تو ایک ایک بات پوچھ کر رہوں گی ——— ہاں تو پھر کیا ہوا؟"
"تمہارا سر ——— جمعراتی بابا! اب میلہ کتنی دور رہ گیا ہے؟
"بس پہنچ گئے بیٹا، یہی میل دو میل"
رابعہ نے پھر نوشابہ کو جھنجھوڑا،
"جمعراتی بابا کو چھوڑو، سیدھے منہ ہم سے بات کرو"
"تم اس قابل ہو کہ تم سے بات کی جائے!"
"یہ بات ہے؟ تو لو ——— جمعراتی بابا!"
"ہاں بیٹا!"
"ان سے نوشابہ سے پوچھو، ——— کون ہے ——— مَس ———؟"
"کیا کہہ رہی ہو بیٹا، مَس کیا؟"
رابعہ نے نوشابہ سے بڑے دھیرے سے کہا،
"کہہ دوں؟ پورا نام لیے دیتی ہوں، (ذرا زور سے) مَس عو
نوشابہ نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا
"چپ، خبردار جو آگے بولی!"
"تو کرو ہم سے باتیں!"
نوشابہ نے جمعراتی بابا کو چھوڑ کر رابعہ سے باتیں شروع کر دیں، آخر اپنی اور مسعود کی داستانِ محبت سنائی ہی پڑی اُسے، ورنہ جمعراتی بابا جان جاتے اور وہ ایک ایک گھر اور ایک ایک کان میں، یہ داستان انڈیل دیتے جا کر!۔

باب ۹

دریا کے کنارے

میلہ کی رونق کا کیا کہنا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کے سارے دیہات اُجڑ گئے ہیں، اور خلقت یہیں سمٹ آئی ہے،

شام ہو چکی تھی، سورج غروب ہو چکا تھا، اندھیرا چھا رہا تھا، رابعہ نے کہا چھولداری میں کب تک بیٹھی رہو گی، چلو ذرا گھوم پھر آئیں۔"

نوشابہ نے جواب دیا،

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہی میں کہنے والی تھی۔"

"تو بس اُٹھو جلدی سے!"

"دونوں جلدی سے بن سنور کر باہر نکلیں چھولداری کے باہر جمعراتی بیٹھا ہوا تھا اور اپنی بیوی سے بے بات کی بات پر لڑ رہا تھا، لڑکی چپ چاپ بیٹھی تھی، لیکن اگر کچھ بولتی تھی تو ماں کی حمایت میں، اور باپ کی مخالفت میں،

رابعہ اور نوشابہ کو باہر آتے دیکھ کر جمعراتی نے جنگ ملتوی کر دی اور کھڑا ہو گیا، اُس نے پوچھا،

کہاں جا رہی ہو بیٹیا؟"

"میلہ کی سیر کرنے!"

"میں بھی چلوں ساتھ؟"

"تو اور کیا ہم اکیلے جائیں گے؟"

جمعراتی نے انگوچھا کاندھے پر ڈال لیا، اپنی مضبوط لاٹھی زمین پر زور سے پٹکی، اور شبراتن کو ایسی نگاہ سے دیکھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ واپس آلوں تو تجھ سے سمجھ لوں گا اُس نے بھی نگاہ ہی نگاہ میں جواب دیا، میں بھی تیار رہوں، واپس آجاؤ تو پھر وہ مزا چکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد کرو گے، بفاتن حسرت سے رابعہ کی طرف دیکھ رہی تھی، شاید اس کا بھی ساتھ چلنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن زبان سے کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، تو شاہ آ سمجھ گئی اُس نے کہا،

"تو بھی چلے گی؟"

وہ گردن جھکا کر بولی،

"میں کیا کروں گی چل کر؟"

"چل سیر کر کے ہمارے ساتھ واپس آجانا۔"

"اتنا سارا کام جو پڑا ہے یہاں!"

"خالی کھانا ہی تو پکانا ہے، وہ شبراتن پکالے گی، اٹھ چل!"

بفاتن نے اجازت طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھا، انھیں بیوی کا غصہ لڑکی پر اتارنے کا نادر موقع مل گیا، کڑک کر بولے،

"بٹیا کہہ رہی ہیں چلتی کیوں نہیں۔"

اس اجازت میں جو لذت پنہاں تھی، اُسے لب و لہجہ کی تلخی بدمزہ نہ کرسکی، وہ مسکراتی

رابعہ نے کہا،

"بابا اسے کچھ مت کہو، یہ ہمارے ساتھ آئی ہے، ہمارے ساتھ رہے گی، ہم یہیں کھڑے ہیں، جاؤ تم ٹکٹ لے آؤ، جلدی سے!"

جمعراتی بابا ٹکٹ لے کر جلدی سے آگئے،

ناٹک بڑا دلچسپ تھا، ایک بوڑھے مرد کی، ایک نوجوان عورت سے شادی کا تماشہ دکھایا گیا تھا، بعض مناظر تو ایسے تھے کہ مجمع ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوا جاتا تھا، بفاتن بھی جی کھول کے ہنس رہی تھی، اس کی ہنسی سے جمعراتی بابا بہت پریشان تھے، وہ زد سے دور تھی، دور نہ ہوتی تو بھی یہاں بھلا مار پیٹ یا ڈانٹ ڈپٹ کا موقع کیا تھا وہ اُسے بڑے غصہ سے گھور رہے تھے، ان کی یہ نگاہ یقیناً لاٹھی کا کام کر جاتی لیکن بفاتن کو ان کی طرف دیکھنے کی فرصت کب تھی۔

رات کو کوئی آٹھ بجے ناٹک ختم ہوا سب لوگ باہر نکلے، ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ نوشابہ کا ہاتھ چھوٹ گیا، وہ باہر نکلی تو نہ جمعراتی بابا نظر آئے نہ رابعہ، یا میرے اللہ اب کیا ہوگا، میں چھولداری تک کیسے پہنچوں گی اس اندھیرے میں راستہ کیسے ڈھونڈوں گی؟ رفتہ رفتہ مجمع چھٹ چکا تھا، اور نوشابہ اکیلی کھڑی رو رہی تھی کہ اتنے میں ایک آدمی اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا، نہ جانے یہ کون ہو، اور میرے ساتھ کس طرح پیش آئے؟ لیکن جب وہ قریب آیا تو نوشابہ پھول کی طرح کھل اٹھی، یہ مسعود تھا، وہ خوشی سے بے قابو ہو کر چیخا،

"ارے تم یہاں کہاں؟"

اس نے خوشی سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکراتی ہوئی بولی،

"میں بھٹک گئی تھی، سب کا ساتھ چھوٹ گیا، یہاں کھڑی رو رہی تھی کہ آپ مل گئے،

ہوئی ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی، یہ لوگ جب ذرا آگے بڑھے، شبراتن کی آواز آئی
دھوبی سے جیتے نہیں، گدھے کے کان اینٹھ رہے ہیں! پوچھو لفاتن نے کیا بگاڑا
تھا تمھارا؟"

جمعراتی کا جی تو چاہا کہ اس دخل در معقولات کا جواب لٹھ سے دے، لیکن رابعہ اور نوشابہ کا لحاظ کر کے چپ ہو گیا، اور خاموشی سے اپنے قافلہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے یہ لوگ بہت دور نکل گئے، سامنے ندی بہہ رہی تھی، اور اُس سے ذرا ہٹ کر ایک میدان تھا جہاں پر بہت سے لوگ جمع تھے، اور نئی نئی دلچسپیوں اور تماشوں میں حصہ لے رہے تھے ایک طرف دو پہلوان کشتی لڑ رہے تھے، رابعہ نے کچھ دیر ٹھہر کر یہ منظر دیکھا، ابھی اس کی دلچسپی قائم تھی کہ نوشابہ نے ٹوکا،

"تو یہ بس دیکھو چلیں کشتی!"

رابعہ بغیر جواب دیئے ہوئے آگے بڑھی، سب اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھوڑی دور آگے بڑھنے کے بعد، رابعہ پھر ٹھٹکی، یہاں ناٹک ہو رہا تھا، بہت دن ہو گئے تھے ناٹک دیکھے ہوئے، پار سال اسی میلہ میں باپ کے ساتھ اس نے ناٹک دیکھا تھا، جی للچایا، جمعراتی سے بولی،

"ہم تو ناٹک دیکھیں گے —— اور نوشابہ تم؟"

"وہ مسکرا کر بولی،

"ہم بھی دیکھیں گے —— اور لفاتن تو؟"

"وہ بھی مسکرائی،

"تم دیکھو گی تو میں بھی ——"

"میں بھی کی بچی —— چلی ہے بٹیا کی برابری کرنے!"

چلیئے، اب مجھے چھولداری تک کسی سے ان نہ پتہ پوچھ کر پہنچا دیجیے، رابعہ ہلکان ہو رہی ہو گی
مسعود نے جھنجھلا کر کہا،

"چھوڑو رابعہ کو، اس کے ہلکان اور پریشان ہونے کی اتنی فکر ہے، یہاں جان سے گذرے جا رہے ہیں، اس کا ذرا خیال نہیں"

"اے نوج خدا نہ کرے!"

خدا نہ کرے، کیا، کل سے چپہ چپہ ڈھونڈ مارا، مگر تمھارا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا، اب خوش قسمتی سے مل گئی ہو تو رابعہ یاد آ رہی ہے! —— آؤ چلیں!"

نوشابہ مسعود کے ساتھ قدم بڑھائے ہوئے چلنے لگی، چلتے چلتے اُس نے کہا،

"بڑی اندھیری رات ہے!"

"تمھاری محبت کی مشعل راستہ دکھائے گی، فکر نہ کرو"

"لیکن کدھر چل رہے ہیں آپ؟"

"دریا کی طرف"

"اس وقت؟"

"یہی تو وقت ہے!"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، دریا کی طرف نہیں چھولداری کی طرف چلیئے!"

"وہاں تو ساری رات رہنا ہے، چلو، ذرا سیر کر لیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد آپ کو وہاں پہنچا دیں گے!"

"اور اگر رابعہ نے کہا اتنی دیر کہاں رہیں؟"

"کہہ دینا راستہ بھٹک گئی تھی، اتنے بڑے میلے ہیں، اور وہ بھی اندھیری رات میں

چھولداری کو ڈھونڈ نکالنا کچھ آسان ہے؟"

چلتے چلتے مسعود نے نوشابہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، ایک بجلی سی دوڑ گئی اس کے سارے بدن میں، وہ سہمے ہوئے لہجہ میں بولی،

"بڑا ڈر لگ رہا ہے مجھے!"

"عورت ہونا!"

چلتے چلتے یہ لوگ، دریا کے کنارے کنارے بہت دور پہنچ گئے تھے، یہاں ایک چھوٹی سی ناؤ رسی سے بندھی ہوئی تیر رہی تھی، کشتی بان کا کہیں پتہ نہیں تھا، شاید کسی مچھیرے کی ہوگی اور وہ اس وقت اپنے بال بچوں کے ساتھ میلہ کی سیر کر رہا ہوگا، ناؤ کو دیکھ کر مسعود نے کہا۔

"آج شاید قدرت بہت مہربان ہے ہم پر!"

"کیوں؟"

"اب ہے سیر کا مزا!"

یہ کہتے کہتے مسعود نے ناؤ کھولی، اور اچک کر اس میں بیٹھ گیا، پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر نوشابہ سے کہا،

"آؤ!"

"میں نہیں آتی؟"

"کیوں؟"

"میرا جی نہیں چاہتا!"

"یہی تو پوچھتا ہوں کیوں؟"

"جی گھبرا رہا ہے۔"

"آخر وجہ؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی لیکن جانے کیوں دل ہول رہا ہے!"

"پانی سے ڈرتی ہو؟"

"نہیں!"

"مجھ سے ڈرتی ہو؟"

"ہاں!"

"مجھ سے، مسعود سے، اپنے محبت کرنے والے سے!"

مسعود ناؤ کے اندر کھڑا کھڑا نوشابہ کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے جھکا، کشتی زیروزبر ہونے لگی، اس نے ذرا پروانہ کی، اس کے ہاتھ نوشابہ تک پہنچ گئے، اور اپنے ناؤ کے اندر گھسیٹ لائے، وہ ناؤ کے اندر مسعود کے بالکل سامنے آکر بیٹھ گئی، اس نے بڑی حسرت اور التجا کے ساتھ کہا،

"واپس چلیے"

وہ اطمینان کے لہجہ میں بولا

"ابھی چلتے ہیں ــــــــــ تم گھبراتی کیوں ہو؟"

نوشابہ نے کوئی جواب نہ دیا، مسعود نے چپو سنبھالے اور ناؤ ہولے ہولے پانی کے سینہ کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی، چلی اور چلتی رہی، نوشابہ سہمی ہوئی، لجائی ہوئی چپ چاپ بیٹھی تھی، ہمیشہ وہ مسعود سے جی کھول کر باتیں کیا کرتی تھی، آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کی زبان بند تھی، وہ بالکل خاموش تھی، خود مسعود پر بھی اس وقت سکوت چھایا ہوا تھا، اگر کچھ آواز تھی تو چپوؤں کے چلنے کی،

تھوڑی دیر کے بعد، پھر نوشابہ نے التجا بھرے لہجہ میں کہا،

"بس اب ہوگئی سیر، واپس چلیئے"

"ابھی سے ؟"

"مسعود نے کشتی کا رُخ موڑا، واپس جانے کے لیے نہیں، کنارے تک پہنچنے کے لیے

کشتی کنارہ پر آکر رُک گئی

نوشابہ نے کہا،

"ارے یہ کیا، آپ تو کنارے پر آگئے، واپس چلیئے نا!"

"ابھی چلتے ہیں، ذرا تم سے باتیں تو کرلیں!"

"میرا اس وقت باتیں کرنے کو ذرا بھی جی نہیں چاہ رہا ہے!"

"کچھ خفا ہو؟"

"خفا کیوں ہوتی!"

"ڈر رہی ہو مجھ سے؟"

"آپ سے کیا ڈر؟"

"پھر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، بس دل گھبرا رہا ہے!"

"تم سہمی سہمی سی کیوں ہو؟ کچھ خوف لگ رہا ہے تمھیں؟"

"ہاں!"

"کس سے؟ اس سناٹے اور خاموشی سے؟"

"ہاں!"

"لیکن یہ ڈرنے کی چیز تو نہیں، ہمارے عشق و محبت کے ترانے سے یہ سناٹا ٹوٹ جائے گا فضا میں نغمے برسنے لگیں گے، نوشابہ، تم اب بھی دور بیٹھی ہو، میرے پاس آؤ، میرے قریب"

اس نے ہاتھ بڑھا کر نوشابہ کو اپنے قریب کر لیا، بالکل اپنے پاس، اسے اپنی گرفت میں لیا، ہونٹوں کی سرحد سے گزر کر بہت جلد وہ رخسار کی وادی میں پہنچ گیا، اور آج شاید وہ اس وادی سے بھی آگے کسی اور منزل کی سمت بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا، یہ منزل مسعود کے لیے جانی بوجھی تھی، البتہ نوشابہ کے لیے لامعلوم اور مبہم بھی

لیکن آج ایک عجیب بات تھی کہ "جنگل پرنس" کی ہیروئن کی طرح نوشابہ کے دل میں امنگیں نہیں اٹھ رہی تھیں، وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ میرا یہ ہیرو مجھے گود میں کیوں نہیں اٹھا لیتا، اور گود میں اٹھا کر لپکتا اور بھاگتا کیوں نہیں، وہ مسعود کی آغوش میں تھی، لیکن اس کا جی چاہ رہا تھا، یہاں سے بھاگ کھڑی ہو، مسعود آج بھی اسے اچھا لگ رہا تھا، اور دنوں سے زیادہ، پھر بھی وہ اس سے ہٹ کر بیٹھنا چاہتی تھی، وہ چاہتی تھی یہ قرب جلد دوری سے بدل دیا جائے!

مسعود نے اسے اپنے سینہ اور ہونٹوں سے قریب کر لیا، وہ کسمسائی، اس گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اس کا وہی حشر ہوا، جو مرغِ نو گرفتار کا ہوتا ہے، جتنا جتنا وہ تڑپی اور پھڑکی، اتنے ہی اتنے دام کے حلقے اور زیادہ سخت ہوتے گئے، یہاں تک کہ تڑپنا اور پھڑکنا بھی اس کے بس میں نہ رہ گیا، اب اگر اس کے بس میں کچھ تھا، تو صرف رونا۔

رفتہ رفتہ دام کے حلقے ڈھیلے ہوئے، اب وہ تڑپ سکتی تھی، پھڑک سکتی تھی لیکن تڑپنے اور پھڑکنے کی سکت اس میں کہاں رہ گئی تھی؟ اور رہ بھی گئی ہوتی تو اس سے حاصل کیا تھا، نتیجہ کیا تھا، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

"نوشابہ نے روتے روتے اپنے فاتح عاشق سے پوچھا

"یہ آپ نے کیا کیا؟"

وہ اس کے گالوں کو، اپنے سخت ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے بولا،

"نوشابہ تم کیوں رو رہی ہو؟ بڑی بے وقوف ہو!"

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کہہ رہی تھی

"بیوقوف نہ ہوتی، تو اپنا سب کچھ لٹا کیوں دیتی؟"

"یہ نہ کہو نوشابہ، تم میرے دل کی رانی ہو، جب ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، سچی محبت کرتے ہیں کہ ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے، یہ کشتی جس میں ہم بیٹھے ہیں، ہماری جیون نیا ہے، اسے ہم کبھی نہ ڈوبنے دیں گے، اور اگر یہ ڈوبی، تو ہم میں سے ہر ایک کو ڈوبنا پڑے گا! —— جب حالت یہ ہے تو روتی کیوں ہو؟ افسوس کاہے کا؟ تمھاری کون چیز تھی جو میری نہ تھی؟ لٹتی وہ چیز ہے، جسے ڈاکو اور قزاق لوٹتے ہیں، میں نے اگر تم سے کچھ چھینا ہے، تو اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز، اپنا دل تمھاری خدمت میں پیش کر دیا ہے، سچ پوچھو تو میں لٹا ہوں، اور تم کہہ اپنے کو رہی ہو!"

یہ باتیں مسعود نے کچھ ایسے سوز اور درد کے ساتھ کہیں کہ نوشابہ کا دل پگھل گیا، اس کی خوفزدہ آنکھیں پھر مہر و محبت کی آنکھیں بن گئیں، جن آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری تھا، انہی آنکھوں سے، اطمینان، مسرت اور فخر کا فوارہ پھوٹ نکلا، مسعود نے نوشابہ کی یہ کیفیت محسوس کر لی، اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر اس نے کہا،

"بتاؤ اب کیا کہتی ہو؟"

"کچھ نہیں لیکن ——"

"وہ لیکن بھی کہہ ڈالو!"

"اگر دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ شادی سے پہلے آپ میرے شوہر بن گئے، تب کیا ہوگا؟"

"دنیا یہ کبھی نہیں جان سکتی۔ اگر جانے گی، تو اسی وقت جب قاضی صاحب کی جیب میں اُن کا نذرانہ پہنچ چکا ہوگا!"

وہ مسکرا دی۔ مسعود نے اس کی لمبی لمبی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا،

"اب تو تمھیں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔"

وہ مسکرائی اور بولی،

"ہے!"

"وہ کیا؟ کس کا؟"

"نوشابہ نے ایک ادا سے مسعود کو دیکھا اور کہا،

"رابعہ کا!"

وہ زور سے ہنستا،

"اور جمعراتی بابا کا نہیں؟"

"ان کا بھی!"

"تم فکر نہ کرو، ان دونوں سے اگر میں شکریہ نہ ادا کرا لوں، تب کہنا ——— اب تم اُٹھ کر بیٹھ جاؤ، ہماری زندگی کا سفینہ دریا کے دھارے کو کاٹتا ہوا آگے بڑھتا ہے!"

نوشابہ نے اپنی لٹیں درست کیں، اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مسعود کے مضبوط ہاتھ پھر چپّوؤں سے کھیلنے لگے، اور ناؤ ندی کے دھارے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی، نوشابہ نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے کہا،

لیکن اب آپ کو جلد ہی اماں سے معاملہ طے کر لینا چاہیئے!"

یہ بات نوشابہ نے اس لیے نہیں کہی تھی کہ وہ افشائے راز اور رسوائی کے خوف سے گھبرا رہی تھی، اس لیے کہی تھی کہ وہ محسوس کر رہی تھی، ابھی تھوڑی دیر میں ہم جدا ہو جائیں گے اور پھر اجنبیوں کی طرح ملیں گے، یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیئے اور ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ عارضی یا مستقل جدائی کا سوال ہی نہ پیدا ہو، امکان ہی نہ باقی رہ جائے۔

مسعود نے چپو چلاتے چلاتے اور دریا کے دھارے پر نظریں جمائے جمائے جواب دیا،

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی نوشابہ! خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا!"

نوشابہ ذرا اور مسعود کے قریب آگئی، اُس نے پوچھا،

"لیکن آپ نے یہ نہ سوچا، ہمارا، آپ کا جوڑ کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"ہم غریب، آپ امیر!"

"محبت غربت اور امارت کو نہیں دیکھتی، جو محبت اس فرق کو دیکھے، وہ محبت نہیں ہوس ہے، شیطانی ہے!"

نوشابہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا مسعود نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"اور پھر تم نے یہ کیسے جانا کہ میں امیر ہوں، میں کوئی نواب زادہ نہیں ہوں، کھاتے پیتے گھر کا ایک فرد ہوں، اور امیر ہوتا بھی تو کیا تھا، ابھی کل کی بات ہے ایڈورڈ ہشتم نے، ایک غریب عورت کی محبت میں انگلستان کا تاج و تخت چھوڑ دیا!"

نوشابہ نے بڑی عقیدت سے مسعود کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں، وہ دل ہی

دل میں اپنے محبوب اور عاشق کی عظمت اور شرافت کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جس بڑے سے بڑے آدمی کا، اپنی محدود فہم و علم کے مطابق تصور کرتی تھی، وہ مسعود سے چھوٹا نظر آتا تھا، کتنی بے پناہ محبت ہے اس شخص کے دل میں ایک غریب بے سہارا اور یتیم لڑکی کی!

کنارہ آ گیا، کشتی رک گئی، دونوں آہستہ آہستہ اترے، چڑھتے وقت نوشابہ کا دل لامعلوم خدشوں اور اندیشوں سے بھرپور تھا، اترتے وقت دل میں محبت کے لازوال اعتماد کے سوا کچھ نہ تھا،

ناؤ سے اترنے کے بعد، نوشابہ نے مسعود سے کہا،

"اب کیا ہوگا؟"

"کیوں؟"

"رابعہ کیا سمجھے گی، کیا کہے گی؟ اور وہ جمعراتی بابا ——"

"تم بڑی وہمی ہو، یہ سب تم سے ہمدردی کریں گے، چلو ذرا!"

مسعود نے نوشابہ سے اس جگہ کا اتہ پتہ پوچھا، جہاں رابعہ کا خیمہ تھا، اور سیدھا اسی طرف چل کھڑا ہوا، وہاں جا کر ایسے بھیانک انداز میں نوشابہ کی بپتا اور اپنی بہادری کا افسانہ سنایا کہ سب دنگ رہ گئے، یوں نوشابہ تم لوگوں سے بچھڑ کر اکیلی رہ گئی، یوں غلط راستہ پر چل کر ایک سنسان مقام پر پہنچی، یوں دو بدمعاشوں نے اس کا پیچھا کیا، پھر میں پہنچ گیا اور دونوں سے بھڑ گیا، اس کشمکش میں میرے بہت چوٹ آئی، دشمن نے سینہ پر ایسا گھونسا مارا کہ میں تیورا کر گر پڑا، وہ تو کہیے بڑی خیر ہوئی، پولیس کی روند آ گئی، وہ دونوں گرفتار ہو گئے اور ہم یہاں چلے آئے، اُفوہ، سینہ میں بڑے

زور کا درد ہو رہا ہے، اچھا اب میں چلا،

مسعود کے جانے کے بعد جمعراتی بابا نے نعرہ لگایا۔

"مرد ہو تو ایسا ہو، جوانی کی قسم ہم بھی کبھی ایسے ہی تھے، پوچھ رلیفاتن کی ماں سے!

"وہ بولی!

ہاں بڑے بہادر، ایک دفعہ کیا ہوا، میلہ سے یہ مجھے سسرال لیے جا رہے

تھے، اندھیری رات تھی، جنگل کا راستہ، راستہ میں ملے چور ———"

جمعراتی بابا نے بات کاٹ کر کہا،

"کیا بک بک لگا رکھی ہے، چپ!"

رابعہ نے کہا،

"جمعراتی بابا، تم بھی تو غضب کرتے ہو، بڑھاپے میں جوانی کی قسم کھاتے ہو!"

بیٹی، مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا"

شبراتن اٹھلا کر بولی!

"بڑے مرد! چوروں سے تو ———"

جمعراتی بابا بھڑ گئے۔

"ارے چوروں کی بچی، تجھ سے کون بات کر رہا ہے، جھوٹی کہیں کی، بات کرنا مشکل

ہو گیا ہے، جب دیکھو، جب لقمہ دیے بیٹھی ہے! دیکھ کہے دیتا ہوں میں بڑا خراب ہوں!"

"یہ تو تمہیں اچھا کون کہہ رہا ہے، ساری دنیا جانتی ہے جیسے ہو! کہے دیتی ہوں

میری زبان نہ کھلوانا، نہیں تو ایک ایک کی دس دس سناؤں گی ہاں!

جمعراتی بابا نے حقہ اٹھایا اور خیمہ سے باہر چلے گئے۔

"تیرے منہ کون لگے!"

ساتھ ساتھ وہ بھی چلی"

جیسی کہو گے ویسی سنو گے!"

باہر آ کر دونوں میں پھر تبادلۂ خیالات ہونے لگا، رابعہ نے نوشابہ کی ران میں زور سے چٹکی لی،

"کیوں رے؟"

نوشابہ نے گردن اوپر اٹھائی تو رابعہ مسکرا رہی تھی، نوشابہ کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا، رابعہ نے ایک چٹکی اور لی،

"میں سب سمجھتی ہوں! مجھے جمعراتی بابا یا شبراتن نہ سمجھنا!"

نوشابہ نے کہا،

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے، اور مجھے آ رہی ہے نیند!"

وہ اوڑھ لپیٹ کر پڑ رہی، رابعہ نے لاکھ گدگدایا، اور چٹکیاں لیں، مگر اس نے ایسی چپ سادھی کہ نہ بولنا تھا نہ بولی، وہ سوچ رہی تھی، کاش یہ گدگدانے والے ہاتھ رابعہ کے نہ ہوتے مسعود کے ہوتے! —

باب ۱

چہ می گوئیاں

نوشابہ اور مسعود پر اب باقاعدہ انگلیاں اُٹھ رہی تھیں، کسی میں اتنا حوصلہ تو نہیں تھا کہ اس کا آنا جانا آمنہ کے ہاں بند کر دیتا، یا نوشابہ پر قدغن لگا دیتا کہ وہ اس سے بالکل نہ ملے لیکن انگلی اٹھانا، نکتہ چینی کرنا، قیاس آرائی کرنا، ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، اس سے کسی کو نہیں روکا جا سکتا، لوگ اگر مسعود کا آنا جانا آمنہ کے ہاں نہیں بند کر سکتے تھے، تو آمنہ لوگوں کی زبان نہیں بند کر سکتی تھی!

اب تک لوگوں کو آمنہ سے ہمدردی تھی، نوشابہ سے محبت تھی، لیکن وہ ہمدردی اب نفرت سے بدل گئی، جب کبھی نجی صحبتوں میں یہ ذکر چھڑ جاتا تو کہنے والے یہاں تک کہہ دیتے آمنہ دلالہ ہے، جو اپنی لڑکی کی کمائی کھا رہی ہے، سب سے زیادہ ہمدرد اس گھر کے شیخ سالار تھے، انھوں نے اب آنا جانا اور ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا، وہ آمنہ اور نوشابہ کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے، رابعہ سے انھوں نے کہہ دیا تھا کہ اگر ادھر گئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔

آمنہ کو لوگوں کی نفرت اور عداوت کا علم تھا، لیکن وہ نوشابہ سے اتنی محبت کرتی تھی اور مسعود پر اتنا بھروسہ کرتی تھی، کہ اس نفرت و عداوت کو لوگوں کا "حسد" قرار دیتی تھی باتیں سنانے والوں اور طعن کرنے والوں کو وہ موقع سے سنا دیتی تھی کہ میری لڑکی کو کچھ نہ

پھلنا دیکھ کر لوگ جلتے ہیں جلا کریں، میں کہتی ہوں، خدانخواستہ تم میں سے کسی نے میری لونڈیا کو مسعود ... نہ پکڑا ہے؟ اس کی کوئی بری بات دیکھی ہے؟ آخر اس کے چال چلن میں کیا بات دیکھی ہے جو جل کر بھسم ہوئے جا رہے ہو، بس یہی نا کہ مسعود نوجوان ہے اس کا نوجوان لڑکی سے ملنا جلنا ٹھیک نہیں ہے لیکن لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ان نوجوانوں کے بیچ میں ایک بڑھیا بھی تو بیٹھی ہے، اور جب تک وہ زندہ ہے، ان میں سے کون بے راہ ہو سکتا ہے؟

لیکن یہ بات ضرور تھی کہ اب آمنہ کو نوشابہ کی شادی کی فکر لگ گئی تھی، وہ ہر وقت یہ سوچا کرتی تھی جس قدر جلد اس فرض سے سبک دوش ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے، اتفاق سے انہی دنوں پاس کے دوسرے قصبے امرت پور سے شیخ غلام علی بھی آ گئے، یہ بھی ساجد میاں کے دوست، اور دور کے رشتہ دار تھے، یہ اس لیے آئے تھے کہ اپنے لڑکے محمد عمر کا رشتہ نوشابہ سے پختہ کر دیں اور اگلے رجب میں اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جائیں، پہلے دن تو وہ آمنہ سے بڑے اخلاق و تپاک سے ملے، تمام معاملات طے کیے اور دوسرے دن آ کر، انھوں نے کہہ دیا کہ فی الحال یہ نسبت نہیں ہو سکتی، آپ ہمارا انتظار نہ کیجیے گا۔

یہ سن کر آمنہ بی چپ ہو گئیں، ٹوہ لگائی تو معلوم ہوا یہ شیخ سلار و کی حرکت ہے، انھوں نے نمک مرچ لگا کر نوشابہ اور مسعود کا قصہ انھیں سنایا، وہ یہاں انکار کر گئے اور رابعہ کا پیام دے گئے، جسے شیخ صاحب نے منظور کر لیا، اب اگلے رجب میں محمد عمر اور نوشابہ کی نہیں، محمد عمر اور رابعہ کی شادی ہو گی، آمنہ نے ایک آہ کی، آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ میاں سے کچھ راز و نیاز کیے اور چپ ہو گئیں، انھیں یقین تھا، یا رابعہ مر جائے گی یا محمد عمر پر فالج گر پڑے گا، لیکن یہ دونوں باتیں ہو جائیں تو بھی نوشابہ کا کیا ہو گا؟ اس کا جواب نہ آسمان نے دیا، نہ دل نے،

نوشابہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ ساری روداد مسعود کو سنا دی اور کہا

"تم کب تک مجھے دھوکا دیتے رہو گے؟"

اُس نے کہا،

"ایسی تیسی غلام علی کی، اُن کے فرزند ارجمند محمد عمر کی، چلو میں چچی سے ابھی سب کچھ طے کیے لیتا ہوں!"

وہ فوراً اپنی مغموم اور پریشان آمنہ چچی کے پاس پہنچا، اُس نے کہا،

"آپ چپ چپ کیوں ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا یونہی!"

"کچھ تو!"

"کوئی خاص بات تو نہیں"

"میں سمجھ گیا آپ نوشابہ کی شادی کے لیے فکر مند ہیں؟"

"ہاں بیٹا بات تو یہی ہے"

"آپ کو شیخ غلام علی کے انکار کا صدمہ ہے؟"

"ہونا ہی چاہیے بیٹا!"

"لیکن اپنے اس غلام کو کیوں نظر انداز کر دیتی ہیں، جو اپنے میں آپ کو دے چکا ہے!"

مایوسی کے اندھیرے میں، امید کا سورج چمکنے لگا، بوڑھے چہرے پر خوشی کی چمک پیدا ہوئی، آمنہ نے پوچھا،

"کیسے کہہ رہے ہو تم بیٹا؟"

"اپنے آپ کو!"

"تم نوشابہ سے شادی کرو گے؟"

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو!"

وہ پھر سے جوان بن گئیں، مسکرائیں اور اپنے منہ بولے بیٹے کی طرف دیکھ کر بولیں،

"بٹیا ٹاٹ میں مخمل کا پیوند نہیں لگتا!"

"ٹاٹ کون ہے اور مخمل کون؟"

"مخمل تم، ٹاٹ ہم!"

آپ کا یہ خیال غلط ہے چچی، نوشابہ جس بڑے سے بڑے گھر میں جائے گی فخر خاندان بن کر رہے گی۔"

بیٹے یہ تمھاری محبت ہے لیکن جو کچھ تم سمجھ رہے ہو، بھیا (قاسم سیٹھ) بھی اسے مان لیں گے یہ کب ضروری ہے!"

"بالکل ضروری ہے!"

"کس طرح؟"

اُنھوں نے شادی میری پسند پر چھوڑ دی ہے، ان کا قول ہے کبھی امیر گھرانے میں شادی نہ کرنا، کسی غریب لیکن شریف لڑکی کو پسند کرنا!"

"سچ؟"

"میں بھلا جھوٹ بولوں گا، وہ بھی آپ سے؟"

"کبھی میں نے تجھے جھوٹ بولتے سنا تو نہیں۔"

"پھر آپ ہی سوچ لیجیے۔"

یہ خیال تیرے دل میں کیسے آیا؟"

یوں تو بہت دنوں سے میں سوچ رہا تھا لیکن یہاں کے لوگوں کی چہ می گوئیوں اور شیخ غلام علی کی کمینہ حرکت کا جواب میں نے یہی سوچا ہے کہ نوشابہ سے شادی کر لوں وہ اگر بدنام ہوئی تو میری وجہ سے، میری شرافت کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اپنی خدمات آپ کی خدمت میں پیش کر دوں!"

"سدا خوش رہو بیٹا، ایک دکھیاری بیوہ کا سہارا بن کر بڑا ثواب لوٹ رہے ہو تم! ——— پھر کب تک؟"

"دو تین ہفتہ کے بعد میں بمبئی جاؤں گا، ابا سے گفتگو کر کے سارے معاملات طے کر لوں گا، پھر یہاں باقاعدہ برات آئے گی اور شادی ہو جائے گی!"

آمنہ نے بڑے محبت بھرے لہجہ میں دعا دی،

"خدا ان آنکھوں کو تیرا سہرا دیکھنا نصیب کرے!"

"آمین! میری بھی دلی تمنا یہی ہے!"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر آمنہ نے پوچھا،

"تو اب جو کوئی پوچھے اس سے کہہ دوں؟"

"چچی اب میں ایک بات آپ سے صاف کہہ دینا چاہتا ہوں"

"کہو بیٹا!"

"آپ خفا تو نہیں ہوں گی؟"

"بھلا میں خفا ہوں گی؟"

"کچھ اعتراض تو نہیں کریں گی مجھ پر؟"

"بالکل نہیں؟"

"اپنے رویّہ میں کوئی تبدیلی ؟"

"بالکل نہیں"

"مجھے اس پر ذرا بھی اعتراض نہیں ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے میری اور نوشابہ کی شادی ہونے والی، مگر

"ہاں ہاں کہو بیٹا، کیا بات ہے ؟"

"اس کا نتیجہ یہ تو نہیں ہوگا کہ میرا، اور نوشابہ کا ملنا جلنا بند ہو جائے گا ؟"

"یہ تو ہوگا، پھر ملوگے تو دنیا کیا کہے گی ؟"

"دنیا تو اب بھی بہت کچھ بکتی ہے مجھے اس کی پروا نہیں لیکن میں اسے گوارا نہیں کر سکتا، کہ یہاں رہوں اور نوشابہ سے نہ ملوں !"

"پھر کیا ؟ پھر کیا ہو ؟ یہ تو پرانی رسم ہے، جب اللہ رکھے تم دونوں ایک ہو رہے ہو، تو کچھ عرصہ تک الگ بھی رہے تو کیا !"

"نہیں چچی میں مر جاؤں گا، میں اسے گوارا نہیں کر سکتا"

"آخر پھر کیا کیا جائے ؟"

"یا تو لوگوں کو بکنے دیجیے، اور یا ان کا خیال ہے تو پھر یہ خبر وقت کے وقت لوگوں کو بتائیے، ابھی گول رکھیے !"

آمنہ نے سوچا، یہ چھوکرا واقعی نوشابہ کی جدائی میں جان دیدے گا، بہت احتیاط سے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد انھوں نے کہا،

"اچھا جو تم کہتے ہو وہی سہی !"

"یعنی کیا فیصلہ کیا آپ نے ؟"

"تم آتے جاتے رہو، ابھی میں اس چیز کا چرچا نہیں کروں گی، اپنی بدنامی دیکھوں یا تمھاری جان کا خیال کروں؟ بدنامی گوارا کر سکتی ہوں، تمھاری جان پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتی!"

"میری چچی کتنی اچھی ہیں آپ؟"

نوشابہ ہی نے مسعود کو ماں کے پاس بھیجا تھا، وہ اوٹ میں کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی، اور دل ہی دل میں مسعود کی ذہانت اور اپنی خوش قسمتی پر فخر کر رہی تھی۔

آمنہ سے باتیں کر کے مسعود چلا گیا، اس کے جانے کے بعد، نوشابہ ماں کے سامنے آئی، آمنہ نے کچھ نہ کہا، لیکن اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا، جن سے یہ دعا پھوٹ پڑ رہی تھی، کہ خدا تیرا سہاگ قائم رکھے، تو جگ جگ جیئے، دنیا کی بہاریں دیکھے اور عیش کی زندگی بسر کرے، دنیا جلتی ہے جلے، یہاں والے حسد کرتے ہیں کریں، تو مسعود سے مل، اور شوق سے مل، میں کوئی پابندی تجھ پر عائد نہیں کروں گی،

کچھ دیر کے بعد آمنہ نے نوشابہ سے پوچھا،

"تو مسعود کا کچھ خیال بھی رکھتی ہے؟"

"کیا ہوا اماں؟ کچھ شکایت کر رہے تھے کیا؟"

وہ فخر و انبساط کے لہجہ میں بولیں،

"بیچارہ شکایت کیا کرے گا، وہ تو ہر وقت گن گایا کرتا ہے، تیرے ——— میں پوچھ رہی تھی، وہ یہاں آتا ہے، کچھ چائے پان سے اس کی خاطر بھی کرتی ہے تو؟"

کیوں نہیں کرتی ——— پھر وہ میری خاطر کا انتظار کب کرتے ہیں، خود ہی پاندان کھینچ کر پان بناتے ہیں اور کھا لیتے ہیں، چائے کا جی چاہتا ہے تو بنوا لیتے ہیں۔

"اُے ہاں، کیوں نہ کرے گھر سمجھتا ہے اپنا اس لیے نا!"

نوشابہ نے ماں کو ٹٹولا

"اُنہی بے تکلفی بھی نہیں اچھی ہوتی۔"

"اے چل ہٹ، بے تکلفی! اپنوں ہی سے ہوتی ہے غیروں سے نہیں ہوتی۔ بڑی آئی کہیں کی!"

"وہ کون سے ہمارے اپنے ہیں؟"

"نہیں ہے تو ہو جائے گا!"

اس نے معصومیت کے ساتھ پوچھا،

"کیسے اماں! وہ اپنے کیسے ہو جائیں گے؟"

"ماں نے بیٹی کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا، اور کہا،

"ہو جائیں گے!"

باب ۱۱

چال

کئی مہینے گذر گئے، دن عید تھا، رات شبرات، گھنٹے دن بن رہے تھے، دن ہفتوں کی صورت اختیار کر رہے تھے، ہفتوں نے مہینوں کا لباس پہن لیا، لیکن نوشابہ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک شیریں خواب دیکھ رہی ہے، جس کا آغاز ابھی ہوا ہے، اور انجام تو اسی وقت معلوم ہوتا ہے، جب آنکھ کھل جائے، خواب ختم ہو لے،

لوگوں کی چہ می گوئیاں بڑھ رہی تھیں، اعتراضات بڑھ رہے تھے، طعن و تشنیع میں اضافہ ہو رہا تھا، لیکن مسعود نے جو شراب آمنہ اور نوشابہ کو پلا دی تھی، اس کا نشہ ترشیوں سے کہاں اُتر سکتا تھا بھلا؟ مسعود روزانہ اس گھر میں آتا تھا، آمنہ علی الاعلان اس کی پذیرائی کرتی تھی، نوشابہ بے فکری سے اس سے ملتی تھی، یہ اعتراض کرنے والے، او طعنے دینے والے لوگ کچھ بھی اس کا نہیں بگاڑ پاتے تھے،

آمنہ باورچی خانے میں مصروفِ کار تھیں، مسعود اور نوشابہ میں اطمینان سے محبت کی باتیں ہو رہی تھیں، مسعود نے کہا

"آخر تم میں ایسی کیا بات ہے کہ مٹا جا رہا ہوں تم پر؟"

وہ چھالیہ کترتے کترتے مسکرائی،

"کچھ بھی نہیں!"

"پھر میں دیوانہ کیوں بن گیا ہوں؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھیے! ——— اونہہ دیوانہ پن کی باتوں کا ذکر کیا!"

مسعود ہنسا،

"چوٹ کر گئیں ہم پر!"

وہ مسکرائی،

"آپ نے بھی تو وار کیا تھا!"

"میرا وار ناکام رہا، تمہاری چوٹ اپنا کام کر گئی!"

"یہ کیسے معلوم؟"

"میرے دل سے پوچھو، میرے جگر سے پوچھو!"

"کلیجی سے کیوں نہ پوچھ لوں، جہاں دل جگر، پھیپھڑا، تلی، سب ہی موجود ہے!"

"بڑی طرار ہو گئی ہو!"

"آپ ہی کا کرشمہ ہے!"

"پھر لاجواب کر دیا تم نے ہم کو!"

"آپ کون سے حاضر جواب ہیں، بڑی غلط فہمی ہے آپ کو اپنے بارے ہیں!"

"ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ نوشابہ کہ تم مجھے یاد بھی کیا کرو گی؟"

"یہ سوال تو آپ اس وقت کرتے، جب میری آنکھوں سے دور ہوتے!"

"اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ آنکھوں سے دور ہونے والا ہوں!"

"نوشابہ چونکی،

کیا مطلب، آپ جا رہے ہیں کہیں ؟"

"ہاں !"

وہ سہم گئی، اس کا شگفتہ چہرہ افسردہ ہو گیا،

"کب ؟"

"کل !"

"کیوں ؟"

تمھیں اپنانے کے لیے !"

نوشابہ کا افسردہ چہرہ پھر شگفتہ ہو گیا

"جھوٹے کہیں کے !"

"سچ کہہ رہا ہوں، خدا کی "

"اچھا قسم نہ کھائیے! یہ تو بتائیے، یہ اک دم سے خیال کیوں آگیا

اک دم سے خیال آگیا! یہ تم کہہ رہی ہو ؟"

"ہاں ــــ بتائیے!"

روز تو لڑا کرتی ہو کہ آپ جھوٹے ہیں، دغاباز ہیں، فریبی ہیں، اماں کو بھی بیوقوف بنایا، اور مجھے بھی محبت کرنا جانتے ہیں، شادی کے نام سے بھاگتے ہیں ــــ بتاؤ غلط کہہ رہا ہوں کچھ ؟"

"نہیں، ٹھیک کہہ رہے ہیں !"

"بس مجھے غصہ آگیا !"

"غصہ کی اس میں کیا بات تھی ؟"

"تم مجھے جھوٹا کہتی ہو، اب میں سچا ثابت کر کے دکھاؤں گا، اپنے آپ کو!"

"دیکھنا ہے!"

دیکھ لینا!"

"اور وہاں جا کر بھول بھال گئے یہ باتیں تو کیا ہوگا؟"

"بھول جاؤں گا تمہیں؛ اپنی زندگی کو، روح کو؛ جان کو، ایمان ——"

"توبہ اللہ، زبان چلتی ہے، تو مشین کی طرح چلتی رہتی ہے، رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی

"اب بس بھی کیجئے، سمجھ گئے سب کچھ!"

"ابھی تم مجھے کہاں سمجھیں؟"

"خوب سمجھ لیا!"

"یہی کہ میں دغاباز اور فریبی ہوں؟"

"نہیں!"

"پھر کیا؟"

"آپ بڑے نیک اور اچھے ہیں۔ آئینہ لاؤں؟"

نوشابہ مسکرادی، مسعود ہنسنے لگا،

اتنے میں آمنہ بی کسی کام سے ادھر آئیں، انھوں نے جاتے جاتے ذرا کے ذرا رک کر پوچھا،

"کاہے پہ یہ قہقہے لگ رہے ہیں؟"

مسعود نے سنجیدگی اختیار کرلی، وہ کھڑا ہوا، اُس نے کہا،

"کچھ نہیں چچی، یونہی ایک بات تھی۔"

"آخر کیا؟ ہم بھی سنیں!"

"ایک لطیفہ تھا!"

"لطیفوں میں کب تک وقت ضائع کرتے رہو گے کالج کا وقت ہو گیا"

آج کالج نہیں جاؤں گا!"

"پھر وہی، کیوں نہیں جاؤ گے؟"

"میں نے ایک مہینہ کی چھٹی لے لی ہے آج سے!"

"ایک مہینہ کی چھٹی؟"

"جی!"

"کیوں بھلا؟"

"بمبئی جا رہا ہوں!"

نوشابہ اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی، آمنہ نے پوچھا،

"کیوں بیٹا بمبئی کیوں جا رہے ہو خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں خیریت ہے سب —— بمبئی اس لیے جا رہا ہوں کہ ابا سے سب کچھ طے کر کے آؤں گا اب کی!"

"خدا مبارک کرے، خط لکھتے رہنا!"

"روز، روز ایک خط لکھوں گا!"

آمنہ بی کا بوڑھا چہرہ مسکرانے لگا، انھوں نے ہنسی میں کہا،

"چل جھوٹا کہیں کا"

"دیکھ لیجئے گا چچی —— اور اگر آپ نے جواب نہیں دیا، تو یہاں آکر خوب

لڑوں گا آپ سے!"

"خدا تجھ لڑنے والے کو سلامت رکھے لیکن بیٹا، ایک مہینہ تو بہت ہوتا ہے!"

"جی ہاں یہ تو صحیح ہے لیکن اباجان کو ہموار کرنا ہے، سارے انتظامات کرنا ہیں، میں ان کا اکلوتا لڑکا ہوں، دھوم دھام میں وہ کسر اٹھا تھوڑے رکھیں گے!"

"اچھا بیٹا سدھارو، خیریت سے جاؤ ــــــ خیریت سے آؤ!"

"بس آپ کی دعا چاہیئے!"

آمنہ بی، پھر بادرچی خانے میں واپس چلی گئیں، اور نوشابہ پھر اپنی جگہ پر آگئی، اس نے کہا

"کیا باتیں ہو رہی تھیں ہم ــــــ میں سب سن رہی تھی!"

"سن رہی تھیں تو پوچھ کیوں رہی ہو؟"

"اب مجھے بناتے بناتے، آپ اماں کو بھی بنانے لگے؟"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"مجھ سے تو آپ کہہ رہے تھے، ہمیں سادگی پسند ہے، ہم دھوم دھڑکا نہیں کریں گے، خالص اسلامی سادگی سے تمام امور انجام دیں گے، اور اماں کو کیا پروگرام بنا رہے تھے آپ؟"

"اسے بنانا نہیں کہتے ہیں بیوقوف!"

"پھر کیا کہتے ہیں؟"

"دل بدست آور کہ حج اکبر است!"

"آہ اسے مسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو!"

"اس مصرعہ کا یہ کون سا موقعہ تھا بھلا؟"

"آپ نے جو مصرعہ پڑھا پہلے اس کا موقعہ بتائیے!"

مسعود نے مسکراتے ہوئے کہا،

"بڑی شریر ہو تو شاباش تم!"

"آپ باتوں میں نہ اُڑائیے، بتائیے، جواب دیجئے!"

"ارے بھئی بات یہ ہے کہ ہم تم نئے زمانے کے ہیں —"

"ہاں تو!"

"اور چچی پرانے زمانے کی ہیں"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"سنو بھی تو!"

"فرمائیے! سن رہی ہوں!"

"ہمیں تمھیں جو سادگی میں مزا آتا ہے، وہی چچی کو دھوم دھڑکے میں آتا ہے"

"مان لیا پھر؟"

لہٰذا تم سے وہ بات کہہ دی جو سچ تھی، اور چچی سے یہ بات کہہ دی کہ یہ پورا مہینہ خوشی خوشی سے اس کے انتظار میں کاٹ لیں!"

"گویا جھوٹ بولنے کی وجہ یہ ہے؟"

"اسے جھوٹ نہیں کہتے ہیں!"

"پھر کیا کہتے ہیں؟"

"مصلحت!"

واہ رہی آپ کی مصلحت!"

"ہاں ہاں مصلحت ہی تو ہے، یہ ایک مہینہ چچی سے کاٹے نہ کٹتا، میں نے وہ بات کہہ دی کہ ان کی باچھیں کھل گئیں، خوش ہو گئیں، انھیں خوش دیکھنے کے لیے میں ایک بار نہیں ہزار بار جھوٹ بول سکتا ہوں!"

نوشابہ نے عاجز آ کر کہا،

"میں ہاری، آپ جیتے، اب بند کیجیے یہ بحث!"

"بہت خوب میں بھی یہی چاہتا تھا، آداب عرض!"

مسعود باہر جانے کے لیے آگے بڑھا، نوشابہ اسے تکنے لگی، دو قدم جا کر وہ پھر واپس آیا، اُس نے کہا،

"ارے مصافحہ تو کیا ہی نہیں، لاؤ ہاتھ بڑھاؤ!"

نوشابہ نے ہاتھ نہیں بڑھایا، ویسی ہی چپ چاپ کھڑی رہی، مسعود نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا، پھر آہستہ سے پیار کیا، اور کہا،

"رخصت نوشابہ، مجھے بھول نہ جانا، میرے خطوں کا جواب برابر دیتی رہنا، ہر روز ایک خط لکھوں گا"

نوشابہ بدستور خاموش کھڑی تھی، مسعود نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، مسعود نے کہا،

"ارے یہ کیا، میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا ہوں، یہ جدائی عارضی ہے، اور اس لیے ہے کہ ہمیشہ ہم وصل کے مزے لوٹیں! ـــــــ مسکراؤ، مسکراؤ جب تک تم مسکراؤ گی نہیں، میں جاؤں گا نہیں! ـــــــ مسکراؤ ورنہ میں بھی روتا ہوں!"

نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے لیکن وہ مسکرا دی، ہونٹ مسکرا رہے تھے، آنکھیں رو رہی تھیں، دل کا ساتھ آنکھ دیتی ہے، لب نہیں دینے پاتے۔
مسعود نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگایا، چوما، اور خدا حافظ کہتا ہوا، چلا گیا، جب تک وہ نظر سے، اوجھل نہیں ہو گیا، نوشابہ اس طرف دیکھتی رہی اس کے جانے کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے، اتنے میں آمنہ بی آگئیں، انھوں نے نوشابہ کے آنسوؤں کا راز سمجھ لیا، اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا،
"روتی کیوں ہے انشاء اللہ وہ جلد آئے گا"

باب ۱۲

انتظار

ایک مہینہ گذر گیا، دو مہینے گذر گئے، تین مہینے گذر گئے، مگر مسعود نہ آیا، اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا، اس نے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا، آمنہ کی آنکھوں کی روشنی روتے روتے جاتی رہی، نوشابہ کی آنکھیں روتے روتے سوج گئیں، مگر وہ نہ آیا، آمنہ کا خیال تھا مسعود نے دھوکا دیا، نوشابہ کو امید تھی، وہ ضرور آئے گا، وہ دھوکا نہیں دے سکتا، وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، وہ بیوفائی نہیں کر سکتا، کبھی کبھی ماں بیٹی میں اس معاملہ پر تکرار بھی ہو جاتی تھی، ایک روز آمنہ نے عشا کی نماز پڑھنے کے بعد، سوتے وقت نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا،

"تو کیوں روتے روتے ہلکان ہوئی جاتی ہے، وہ بدذات کبھی نہیں آئے گا، اس نے مجھے دھوکا دیا، خدا اُسے دھوکا دے، تو روتی کیوں ہے؟ میں اپنی گڑیا کے لیے چاند سا دولھا بیاہ کر لاؤں گی!"

نوشابہ اور زیادہ رونے لگی، اس نے روتے روتے ماں سے کہا،

"یہ نہ کہو ماں!"

"کیا نہ کہوں؟"

انھیں دھوکا باز مت کہو، کوئی ایسی ہی بات ہوگئی ہے جو نہ آسکے، وہ دھوکا باز نہیں ہیں!"

آمنہ بی جل گئیں، انھوں نے کہا،

"کیا ساری زندگی اُس کا انتظار کرتی رہوں۔ دھوکا باز نہیں تھا تو اُس نے کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟"

"کوئی مجبوری ہوگی۔"

آمنہ نے جل کر کہا،

"کوئی مجبوری ہوگی، یہاں سے اتنے سارے خط گئے، انہی میں سے کسی کا جواب دیا ہوتا موئے نے۔"

"ضرور دیا ہوگا جواب!"

"تو کہاں ہے وہ؟"

"یہاں کے لوگوں نے غائب کر دیا ہوگا!"

"وہ آیا کیوں نہیں؟ مہینہ بھر کو کہہ کر گیا تھا، تین مہینے ہو گئے!"

"تین برس ہو جائیں، وہ آئیں گے ضرور!"

"واہ ری تیری امید، کہیں آیا نہ ہو۔"

"اور دے لو بد دعائیں، لیکن مجھے امید ہے وہ آئیں گے ضرور!"

وہ آئے یا نہ آئے، مگر اب میں اس کا انتظار نہیں کر سکتی، اب اگر آیا بھی منہ جھلس دوں گی اس کا، مجھے نہیں چاہیے ایسا جعلیا داماد!"

"اماں انھیں میرے سامنے بُرا نہ کہو!"

یہ لو، اب مجھ پر بھی حکم چلانے لگیں! ——— وہ آئے بھی تو اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی اسے!"

"کیوں؟"

"میرا گھر، میری مرضی!"

"اپنی ضد پر مجھے قربان کردو گی اماں؟"

"کیا مطلب؟"

"ایسی باتیں کروگی تو میں جان دیدوں گی!"

آمنہ بی بی ذرا پسیجیں، انھوں نے گفتگو کا سلسلہ بند کردیا، دل ہی دل میں مسعود کو بد دعائیں، اور نوشابہ کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی ہوئی وہ سوگئیں، اور نوشابہ کیا وہ بھی سوگئی؟ اس کی آنکھیں نیند سے محروم تھیں، وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی تھی، لیکن نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہیں تھا، مسعود کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور وہ دل ہی دل میں اس سے باتیں کررہی تھی، پوچھ رہی تھی،

"تم کہاں ہو؟ میرے دل کی دنیا برباد کرکے کہاں چین کررہے ہو؟"

تصویر مسکرائی اور خاموش ہوگئی،

نوشابہ نے پھر پوچھا،

"بولتے کیوں نہیں؟ یا تو پہروں باتیں کیا کرتے تھے، یا میں باتیں کررہی ہوں اور تم جواب نہیں دیتے، یہ بے مروتی کہاں سے سیکھ لی تم نے؟"

تصویر نے لبِ خاموش سے جواب دیا،

"تم بھی مجھے بے مروت کہتی ہو؟ تم بھی مجھ سے خفا ہوگئیں؟ میں آؤں گا، بہت جلد

آؤں گا، میرا انتظار کرو!"

"لیکن کب تک؟"

"جب تک میں نہ آجاؤں!"

"کب آؤگے؟"

"بہت جلد!"

نوشابہ مطمئن ہوگئی، اس کے آنسو خشک ہوگئے، رفتہ رفتہ مسعود کی تصویر اس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی، اب وہ بہت مطمئن تھی، بہت خوش تھی، اسے یقین تھا مسعود آئے گا، جلد آئے گا، اور اس کے آنے کے بعد بپتا کا یہ دور ختم ہوجائے گا، پھر ایسی خوشی اور مسرت کا دور شروع ہوگا، جو کبھی نہیں ختم ہوگا۔

دوسرے دن ایک کام سے، وہ اپنے باغ کی طرف گئی، راستہ میں رابعہ مل گئی بہت دنوں سے یہ دونوں سہیلیاں بچھڑی ہوئی تھیں، دونوں کو حکم تھا، کہ ہرگز ایک دوسرے سے نہ ملیں لیکن جب آمنا سامنا ہوگیا تو انھیں ملنے سے کوئی نہ روک سکا، اب نہ رابعہ کے دل میں شیخ سلارو کی دہشت تھی، نہ نوشابہ کے دل میں آمنہ کا اندیشہ،

رابعہ اسے دیکھ کر مسکرائی،

"بے مروت کہیں کی!"

نوشابہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا،

"بے وفا کہیں کی!"

وہ بولی،

"میں یا تو؟"

اس نے جواب دیا،

"تو بامیں"

دونوں ہنسنے لگیں،

رابعہ نے کہا،

اری سنتی ہے، یہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، وہ تیرا مسعود دھوکا دے گیا تجھے، اب وہ کبھی نہیں آئے گا!"

"لوگوں کا کیا، وہ تو جھوٹ بولتے ہی ہیں!

"تجھے یقین ہے وہ آئے گا؟"

"ہاں!"

"تو انتظار کرتی رہے گی اس کا؟"

"کیوں نہ کروں گی؟ جو میری زندگی بن چکا اس کا انتظار نہ کروں گی!"

"حد بھی ہے کوئی اس انتظار کی؟

"عمر بھر!"

رابعہ کو ترس آگیا، اس نے بڑی محبت کے ساتھ کہا،

"تو اس کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے، اور وہ تجھ سے بالکل محبت نہیں کرتا!"

"یہ کیسے جانا تم نے؟"

"سنا ہے وہ تجھے خط بھی تو نہیں لکھتا!

"ہاں ـــــ ہو گی کوئی مجبوری!"

"اتنی اندھی محبت نہ کرو پگلی، میں نے اور بھی، بہت کچھ سنا ہے!"

"جو کچھ سنا ہے جھوٹ سنا ہے!"

پھر اشتیاق پیدا ہوا کہ معلوم کرے کہ کیا سنا ہے!"

"کیا سنا ہے بتاؤ؟"

"کیا کروں بتا کر؟"

"کیوں؟"

"جب تو اعتبار ہی نہیں کرتی تو بتانے سے فائدہ؟"

"اعتبار کروں یا نہ کروں، تجھے بتانا پڑے گا!"

رابعہ نے کہا،

"میں نے سنا ہے، وہ اور بھی کئی لڑکیوں کو اسی طرح دھوکے دے کر خراب کر چکا ہے"

"یہ کس سے سنا ہے؟"

"ابا کہہ رہے تھے، وہ یہاں سے تھوڑی دور پر جو گاؤں گوسائیں گنج ہے نا؟"

"ہاں ہاں جانتی ہوں!"

"وہاں بھی وہ جایا کرتا تھا!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، شکار کو جاتے ہوں گے!"

"ہاں شکار ہی کو تو ـــــ بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کے شکار کو!"

"جھوٹ!"

"او نہہ سنو تو، وہاں ایک لڑکی ہے رانی، ٹھاکر رام چند کی، اسے ہندو ن کر اس نے پھنسایا اور خراب کیا!"

"بالکل جھوٹ!"

"ہوگا بھئی ہمیں کیا معلوم، ہم نے جو سنا وہ کہہ دیا!"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر رابعہ نے کہا،

"کیوں ری بہت چاہتی ہے انھیں؟"

اس نے بے تامل جواب دیا،

"ہاں بہت!"

"تجھے یقین ہے وہ تجھ سے محبت کرتا ہے؟"

"ہاں!"

"اور اگر معلوم ہو جائے کہ وہ محبت نہیں کرتا، تب کیا کرے گی تو؟"

"پھر نفرت کرنے لگوں گی!"

"بس نفرت ہی؟"

"اور کیا کر سکتی ہوں؟"

"بدلہ؟ مزہ نہیں چکھائے گی، ایسے بیوفا کو!"

"بدلہ بھی لوں گی مزہ بھی چکھاؤں گی!"

رابعہ ہنسنے لگی،

"پگلی کہیں کی!"

"یہ کیوں؟"

"بدلہ لے گی، مزہ چکھائے گی، تو گاؤں کی چھوری، وہ شہر کا کھلاڑی، تو بھلا کیا بگاڑ سکے گی اس کا!"

نوشابہ اونھ کر کے بولی،

لیکن تم ایسی اَن ہونی باتیں کیوں کرتی ہو رابعہ ——— وہ ایسے نہیں ہیں، وہ بڑے اچھے ہیں، وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، وہ مجھ کو دل سے پیار کرتے ہیں، وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے، لوگ جو کچھ کہتے ہیں، تم ان کا یقین نہ کرو ——— میری خاطر سے!"

نوشابہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اور رابعہ کی بھی، وہ سوچنے لگی کتنی بے پناہ محبت ہے، نوشابہ کو مسعود سے، واقعی اس کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، اُس نے نوشابہ کے آنسو اپنے دوپٹہ سے پونچھتے ہوئے کہا،

"اب نہیں کروں گی معاف کردو"

نوشابہ بولی،

"رابعہ تو بھی محبت کرتی ہے کسی سے؟"

رابعہ چپ رہی، اُس نے پھر چھیڑا،

"بول میں کیا پوچھ رہی ہوں؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا،

"تو تو پگلی ہے، تیری بات کا جواب کیا دوں؟

"تجھے میری قسم سچ سچ بتا!"

رابعہ نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا،

"کیوں نہیں کرتی!"

"کرتی ہے! کس سے؟"

"اسی سے جس کے دامن سے باندھی جانے والی ہوں!"

"تو نے دیکھا ہے اسے؟"

"نہیں!"

"پھر تو محبت کیسے کرنے لگی؟"

"ان کا ذکر گھر میں سنتی رہتی ہوں، سنا ہے بڑے جیالے ہیں"

یہ سن کر محبت آگئی تجھے؟"

"یہی سمجھ لے!"

"اب بتا پگلی تو ہے یا میں؟"

"ہم تم دونوں!"

دونوں ساتھ ہنسنے لگیں،

رابعہ نے کہا،

"اب جاتی ہوں، دیکھیں اب کب ملنا ہوتا ہے؟"

"اور کیا، ملنا بھی تو اپنے بس کا نہیں، نہ جانے سلار و چچا کو کیا ہو گیا ہے، کیوں خفا ہیں اتنے ہم سے!"

"اُدھر اُن کا یہی حال ہے! ——— تو کچھ بیمار سی دکھتی ہے مجھے!"

"ہاں آج کل میری طبیعت خراب ہے کچھ کچھ! پیٹ میں مروڑ کبھی کبھی ہوتی ہے، جی بھی متلاتا رہتا ہے، کبھی کبھی قے بھی ہو جاتی ہے!"

"تو علاج کیوں نہیں کرتی؟"

"کرتی تو ہوں! ——— نمک سلیمانی گھر میں رکھا ہے، جب بھی مروڑ ہوتی ہے یا جی متلاتا ہے، وہی پھانک لیتی ہوں، تھوڑا سا، بس طبیعت ٹھہر جاتی ہے!"

دونوں اسی طرح باتیں کرتی ہوئی ساتھ ساتھ کچھ دور چلتی رہیں، پھر اپنے اپنے گھر کی طرف مڑ گئیں ❊

باب ۱۳

افشائے راز

نوشابہ تو کسی نہ کسی طرح غمِ جدائی برداشت کر رہی تھی، لیکن آمنہ بی بی زیادہ عرصہ تک مسعود کی گمشدگی کے غم کو برداشت نہ کر سکیں، وہ بیمار پڑ گئیں، جوان نہ تھیں کہ بیماری کا حملہ آسانی سے جھیل لیتیں، بوڑھی تھیں، پھر ستم دیدہ، ایک شوہر کا غم، دوسرا مسعود کا، تیسرا نوشابہ کی کس مپرسی اور افسردگی کا، ان سب غموں نے مل کر اُن کی صحت برباد کر دی، اور وہ چارپائی سے لگ گئیں،

جب تک وہ معمولی طور سے بیمار رہیں، خود ہی اپنا علاج کرتی رہیں، جب بیماری بڑھی تو وید یا حکیم کا سوال پیدا ہوا، شیخ سلارو اگرچہ اس گھر میں قدم نہیں رکھتے تھے لیکن انھیں خبر ہر چیز کی رہتی تھی، آمنہ کی یہ کیفیت معلوم کر کے ان سے ضبط نہ ہوا، وہ خود حکیم صاحب کو لے کر پہنچے، آمنہ کو دیکھ کر شیخ صاحب سے حکیم نے کہہ دیا، یہ اب بچ نہیں سکتیں، زیادہ سے زیادہ یہ دو تین دن کی مہمان ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، انھیں کوئی غم ہے، وہ غم دور ہو جائے تو شاید طبیعت سنبھل جائے،

حکیم صاحب کو تو شیخ صاحب نے رخصت کیا، اور آمنہ کو مع نوشابہ کے لے کر اپنے گھر آ گئے، انھوں نے خیال کیا، یہاں نہ تیمارداری ہو سکتی ہے نہ علاج، نہ پرہیز ——،

آمنہ پہ اکثر بیہوشی کے دورے پڑتے رہتے تھے، یہاں وہ بیہوشی ہی کے عالم میں آئی تھیں، آنکھ کھلی تو نیا گھر، نیا ماحول، نئے لوگ، شیخ صاحب سرہانے بیٹھے تھے انھوں نے کہا
"بھابی، میں تمھیں یہاں لے آیا ہوں، وہاں تمھارا علاج ٹھیک سے نہیں ہو سکتا تھا"
آمنہ کی آنکھوں سے یہ ہمدردی دیکھ کر آنسو بہنے لگے، شیخ صاحب بھی رو ہانسے ہو گئے، انھوں نے تسلّی دی،
"تم روتی کیوں ہو؟ جلدی اچھی ہو جاؤ گی ——— میں جانتا ہوں مسعود کا غم، تمھیں کھائے جاتا ہے، تم فکر نہ کرو، میں اس کا پتہ بھی لگاؤں گا"
آنکھوں آنکھوں میں آمنہ بی نے شیخ صاحب کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا، کیونکہ بولنے کی ان میں سکت نہیں رہ گئی تھی
تھوڑی دیر کے بعد شیخ سلار روانگوچھا کاندھے پر ڈال کر سیدھے کالج پہنچے اور پرنسپل کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے، اس نے ایک نظر اُن کے سرتاپا ڈالی اور کہا
"کیسے تشریف لانا ہوا؟"
"یہاں ایک بمبئی کا لڑکا پڑھتا تھا مسعود، اس کا پتہ پوچھنا ہے!"
پرنسپل صاحب نے حیرت سے پوچھا،
"مسعود؟"
"جی مسعود!"
"اس نام کا تو کوئی لڑکا یہاں نہیں پڑھتا!"
"جی پڑھتا نہیں، دو تین مہینے ہوئے پڑھتا تھا!"
"اس نام کا کوئی لڑکا ہمارے کالج میں کبھی نہیں داخل ہوا!"

یہ خبر سن کر وفورِ حیرت سے شیخ صاحب بیہوش ہوتے ہوتے بچے، انھوں نے

آخری نشان دیا،

"وہ بمبئی کا تھا!"

بمبئی کے تو یہاں درجنوں لڑکے پڑھتے ہیں، نام بتائیے تو پتہ چلے، اس کا نام مسعود

نہیں کچھ اور ہوگا"،

"نام تو مسعود ہی تھا!"

"جی نہیں"

"گورا گورا سا، خوبصورت سا،"

"آخر بات کیا ہے؟"

"بات تو کچھ نہیں ہے —— ایک بوڑھی بیوہ اور ایک جوان لڑکی کو وہ

دھوکا دے کر روپوش ہوگیا ہے!"

"ہمارے کالج کا لڑکا؟"

"جی!"

"یہ کبھی نہیں ہوسکتا!"

"تو صاحب میں کچھ جھوٹ بولتا ہوں"

پرنسپل صاحب کو جلال آگیا

آپ بالکل جھوٹے ہیں، ہمارے ہاں کے لڑکے، آپ کی طرف جاتے ہیں اور

نہ جاسکتے ہیں! آپ تشریف لے جائیے!"

شیخ صاحب غصہ میں بھرے ہوئے واپس آئے، آمنہ بی بی اچھی ہوئیں تو ان سے

خوب لڑتے، اور دل کی بھڑاس نکالتے لیکن وہ بستر مرگ پر دراز تھیں، دل کی دل ہی میں رہ گئی، آمنہ نے حسرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کمزور آواز میں پوچھا

"کچھ پتہ چلا بھیا"

"ابھی تو نہیں چلا لیکن تم اطمینان رکھو، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا!"

"میں اب بچ نہیں سکتی، اس نے نوشابہ سے شادی کا وعدہ کیا تھا، ہائے میرے بعد میری بچی کا کیا ہوگا؟"

وہ پھر رونے لگیں، شیخ صاحب نے انھیں تسلّی دی،

"تم بالکل پریشان نہ ہو، میں مسعود کو ڈھونڈوں گا، خود بمبئی جاکر سراغ لگاؤں گا اور اس کی شادی نوشابہ کے ساتھ کرکے رہوں گا"

"جب تک وہ نہ ملے میری بچی کا خیال رکھنا!"

"وہ میری بچی بھی ہے بھائی!"

"یہ کہتے کہتے شیخ صاحب خود بھی رونے لگے، اتنے میں آمنہ بی بی نے ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئیں، سارے گھر میں کہرام مچ گیا، نوشابہ بھی پچھاڑیں کھا رہی تھی، اور رابعہ بھی، خود شیخ صاحب بھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

تجہیز و تکفین کی تیاریاں شروع ہوئیں، گاؤں کے لوگ اگرچہ آمنہ بی بی سے خفا تھے لیکن کچھ ساجد میاں کا خیال کرکے اور کچھ شیخ صاحب کے لحاظ سے کافی تعداد میں جمع ہوگئے۔

نوشابہ روتے روتے ہلکان ہوئی جارہی تھی، دفعتہ اس کے پیٹ میں پھر مروڑ ہوئی، اٹھنا دوبھر ہوگیا، اس نے رابعہ سے کہا،

پھر بڑے زور کا درد ہو رہا ہے، ایک بجلی سی چمک جاتی ہے درد کی، شاید میرا
بھی آخری وقت آگیا ہے، مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔"

رابعہ کے سہارے نوشابہ اپنے کمرے میں پہنچی، اور تڑپنے لگی۔ رابعہ کی ماں اور دوسری
عورتیں، آمنہ بی کے غسل میت میں لگی ہوئی تھیں۔ در وہ نوشابہ کو سنبھال رہی تھی نوشابہ
کا واقعی درد کے مارے دم نکلا جا رہا تھا، وہ پچھاڑیں کھاتی تھی، سر پٹختی تھی، ایڑیاں
رگڑتی تھی، روتی تھی، بلبلاتی تھی، لیکن درد تھا کہ برابر بڑھ رہا تھا۔ یہ وقت ایسا تھا کہ
نہ کوئی حکیم آسکتا تھا، نہ وید اتفاق سے یہاں نمک سلیمانی بھی نہ تھا۔ وہ نوشابہ جلدی میں اپنے
گھر ہی چھوڑ آئی تھی۔"

رات کے نو بجے جنازہ تیار ہوا، شیخ صاحب آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے
جنازہ باہر لے جانے کا انتظام کر رہے تھے کہ رابعہ گھبرائی ہوئی آئی۔ دہشت کے سبب اس کا
چہرہ سفید پڑ گیا تھا، ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے، یہ حال دیکھ کر شیخ صاحب نے پوچھا،

"کیا بات ہے؟"

"نوشابہ بیہوش پڑی ہے اور"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، شیخ صاحب نے پوچھا،

پوری بات کہو، اور کیا ہوا؟

رابعہ نے کہا،

"وہ بیہوش پڑی ہے اور"

وہ پھر رک گئی، شیخ صاحب جھنجلا گئے، انھوں نے ڈانٹ کر کہا

"کہتی کیوں نہیں؟

رابعہ نے جلدی سے کہا

اور ـــــــــ اور اس کے لڑکی پیدا ہوئی ہے!"

وہ غصہ سے بے قابو ہو گئے اور زور سے چیخے!

"کیا بک رہی ہے کس کے لڑکی پیدا ہوئی؟

"نوشابہ کے!"

رابعہ نے یہ کہا اور اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ شیخ صاحب نے یہ سنا اور دم بخود رہ گئے۔ ان کا جی چاہا کہ نوشابہ کا اور اس کی نوزائیدہ لڑکی کا گلا گھونٹ دیں اور آمنہ بی بی کے ساتھ ان دونوں کو بھی دفن کر دیں لیکن یہ سوچتے سوچتے آمنہ کا نزع کا عالم یاد آگیا، جب اس نے اپنی لڑکی ان کے حوالے کی تھی، اور انھوں نے اپنی بچی رابعہ کی طرح اس کی رکھوالی کا وعدہ کیا تھا، ساجد میاں بھی انھیں یاد آگئے، جو ان سے عالمِ خیال میں کہہ رہے تھے، میری لڑکی لاکھ نالائق سہی لیکن وہ آوارہ اور بدمعاش نہیں ہے، ایک شریف صورت شخص نے اسے دھوکا دیا اور فریب خوردگی کے عالم میں وہ ایک غلطی کر بیٹھی اس غلطی کی اگر اسے سزا دو گے تو حشر کے دن مجھے کیا منہ دکھاؤ گے!"

شیخ صاحب کا غصہ دھیما پڑ گیا، وہ سیدھے رابعہ کی ماں کے پاس پہنچے، اس نے کہا

"کچھ! دو سنا تم نے؟"

"سنا بھی اور دیکھ بھی لیا!"

وہی نوشابہ ـــــ"

ہاں ہاں وہی! خود تو مکر کیے بیہوش پڑی ہے، اور باپ کی پوٹ اس کی لڑکی چیخ چیخ کر سارا گلا سر پر اٹھائے ہوئے ہے، لعنت ہے ایسی زندگی پر ـــــ

کہے دیتی ہوں، میرے گھر میں ایسی شیطان کی خالاؤں کا ایک دن بھی گذر نہیں ہو سکتا۔
شابہ کو اور اس کی بچی کو نکالو ابھی یہاں سے!"

شیخ صاحب نے کہا،
"میں تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہوں"
"ہائے میرے اللہ، تو کیا اسے یہیں رکھو گے؟"
"بیشک!"
"تو میں رابعہ کو لے کر اپنے میکہ جاتی ہوں، خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے"
"چپ رہو، جو میں کہتا ہوں سنو!"
"کہو!"
پہلے یہاں سے آمنہ کا جنازہ جانے دو، ابھی اس خبر کا زیادہ چرچا نہ کرو!"
اے مجھے کیا پڑی ہے، چرچا کرنے کی، لڑکی نے خود ہی رو رو کر سب کو بتا دیا کہ
میں آسمان سے اتر آئی ہوں، مولی کی آواز بھی کتنی پاٹ دار ہے، ابھی پیدا ہوئے دیر
دیر نہیں ہوئی، اور سارا گھر سر پر اٹھا لیا ــــ"
"پھر وہی بیکار باتیں، اگر پتہ چل گیا ہے تو چلنے دو، تم یہ کرو کہ لوشابہ کے کمرہ
میں کسی کو نہ جانے دو، نہ اس مسئلہ پر کسی سے بات کرو، بچی کا خیال رکھو، نماز جنازہ پڑھ کر
میں آتا ہوں، پھر سوچیں گے بیٹھ کر ہم تم!"
"جاؤ، میرا تو کسی کی صورت پر بھی پھٹکار بھیجنے کا جی نہیں چاہتا، ایک مر جائی
دوسری حرامی! ساجد میاں کے گھر میں اور ایسے شیطان، توبہ میری الٰہی!"
شیخ صاحب نے بیوی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی،

"تم سے کم مجھے نفرت نہیں ہے، ان دونوں سے لیکن ساجد کا خیال روکتا ہے ایسے دوست کی لڑکی کو، میں کس طرح گھر سے نکال دوں؟ وہ بُری ہے، ہم اس کے ساتھ کیوں بُرے بن جائیں، اس کا کیا اس کے ساتھ، ہمارا کیا ہمارے ساتھ!"

"اچھا اچھا، سمجھ لیا سب کچھ جاؤ، جنازہ کو دیر ہو رہی ہے!"

"جاتا ہوں لیکن ایک بات سن لو!"

"اونھ کہہ بھی چکو!"

"تم نوشابہ کو کوئی انحال نہ طعنہ دینا نہ صلواتیں سنانا۔"

"تم ہی نے تو بدنام کیا ہے مجھے، میں بھلا کیوں کسی کو طعنہ دوں گی، یا صلواتیں سناؤں گی"

"ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہو گئی، تم واقعی بڑی نیک ہو، امید ہے اس وقت اس کا اور زیادہ خیال رکھو گی!"

شیخ صاحب چلے ہی تھے کہ بیوی نے کہا،

"ایک بات میری بھی سن کو کان کھول کے!"

وہ لوٹ آئے

"کہو کیا کہتی ہو؟"

"رابعہ اور نوشابہ کا اب آمنا سامنا نہیں ہو سکتا، رابعہ اب پردہ کرے گی نوشابہ سے۔ تمہارا گھر ہے، تم جب تک چاہو اسے رکھو لیکن رابعہ پر اس کلموئی کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا!"

"تمھیں اختیار ہے!"

شیخ صاحب جنازہ کے ساتھ قبرستان گئے، اور وہ نوشابہ کے کمرہ میں پہنچیں اب

نوشابہ کو ہوش آچکا تھا، اس کی ننھی سہی بچی اس کے پاس پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی، رابعہ نوشابہ کے آنسو پونچھنے اور بچی کو بہلانے کی بیک وقت کوشش کر رہی تھی، وہ آتے ہی گرجیں، رابعہ کو انھوں نے جھنجھوڑ کر دھکا دیا، وہ گرتے گرتے بچی، پھر فرمایا،

"تو یہاں کیا کر رہی ہے چڑیل؟"

رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ کھڑی ہو گئی، انھوں نے حکم دیا۔

"لو اور سنو، حرامی بچی کو پالیں گی صاحبزادی، آوارہ عورتوں کے آنسو پونچھیں گی اپنے دامن سے ——— نکل، چل یہاں سے دور ہو ——— خبردار جو اب میں نے تجھے اس کمرے میں قدم رکھتے، یا اس (نوشابہ کی طرف اشارہ کر کے) حرافہ سے بات کرتے دیکھا"

رابعہ خاموشی کے ساتھ کمرہ سے باہر چلی گئی، کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتی رہیں پھر انھوں نے نوشابہ سے کہا:

"شاباش ہے! ——— خوب نام روشن کیا تم نے اپنے باپ کا!"

نوشابہ کیا جواب دیتی، رو رہی تھی اور زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگی، انھوں نے کہا،

"نا بابا میرے گھر میں ایسوں کا گزارہ نہیں، بوریہ بستر اٹھاؤ اور اپنی راہ لو!"

باب ۱۴

اے عشق کہیں لے چل

شیخ صاحب نوشابہ سے اگر بات نہیں کرتے تھے تو اس کا دل بھی نہیں دکھاتے تھے، وہ اس سے نفرت کرتے تھے، لیکن اس پر رحم بھی کھاتے تھے، اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے لیکن اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے، رابعہ کو اجازت نہیں تھی اس کی طرف سے کہ وہ نوشابہ کے کمرہ میں قدم رکھ سکے یا اس سے بات کر سکے، نوشابہ کو اس کی چچی کی طرف سے حکم ملا تھا کہ خبردار کمرے سے باہر قدم نہ نکالنا، کونے لگی بنی یہیں پڑی رہو، بچا کھچا کھانا یہیں مل جائے گا، دن بھر اگر پاخانہ پیشاب کی ضرورت ہو تو ضبط کرو۔ رات کو جب سب سو جائیں اور صبح کو جب تک سوتے رہیں تمہیں حق ہے کہ چوروں کی طرح اپنی کوٹھری سے نکلو، اور جتنی مرتبہ جی چاہے پاخانہ کی سیر کرو، دن کو شدید سے شدید ضرورت کے موقع پر بھی تم کمرہ سے باہر نہیں نکل سکتیں، نوشابہ بڑی سختی سے اس حکم کی تعمیل کرتی تھی، سچ پوچھیے تو اس پابندی میں اسے آرام بھی تھا، وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ گھر کے لوگوں کی حقارت بھری نظریں اس پر پڑیں، وہ خود اپنے روئے سیاہ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ کوئی اسے دیکھے، اگر چچی یہ حکم نہ دیتیں، تو وہ خود رضاکارانہ طور پر ان ہدایات پر عمل کرتی۔

نوشابہ کا کام اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ دن بھر کوٹھری میں پڑے پڑے، اپنی ننھی سی، خوبصورت بچی کو دودھ پلائے، اُسے گود میں لے کر ٹہلے، اس سے جو وقت بچے، وہ رونے میں، اور مسعود کو یاد کرنے میں صرف کرے، اس کا دل اب تک مسعود سے صاف تھا، اسے یقین تھا انھوں نے دھوکا نہیں کیا ہے، ان پر کچھ ایسی ہی بپتا پڑی ہے کہ آ نہ سکے، خط نہ لکھ سکے، لیکن وہ ایک نہ ایک دن آئیں گے ضرور، جس دن آئیں گے میری مصیبتیں اسی دن ختم ہو جائیں گی، وہ مجھے پیار کریں گے، میری بپتا پر آٹھ آٹھ آنسو بہائیں گے، میری وفاداریوں کی داد دیں گے، اور اپنی اس ننھی منی سی بچی کو کلیجے سے لگائیں گے، لیکن یا اللہ وہ مبارک دن کب آئے گا؟ غم کی یہ اندھیاری رات کب ختم ہوگی؟ اور خوشی کا سورج کب جگمگائے گا——؟

اور وہ یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ چچی قہر و جلال کا مجسمہ بنی ہوئی تشریف لائیں انھیں دیکھ کر نوشابہ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، انھوں نے کہا،

"میں پوچھتی ہوں، ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ کب تک بنی رہو گی کبھی دفع ہو گی اس گھر سے یا نہیں؟"

نوشابہ اس اردو ئے معلّی کا جواب نہ دے سکی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور چپ چاپ گردن جھکائے کھڑی رہی، یہ خاموشی چچی کے لیے اور زیادہ اشتعال انگیز ثابت ہوئی، انھوں نے کہا، "

وہ صورت ہے، اور یہ لچھن یہ ہیں، یہ چھی چھی—— میری لڑکی تیری جگہ خدانخواستہ ہوتی، تو اس کا گلا گھونٹ دیتی —— ہو گی بے غیرت، بے حیا، نہ مرتی ہے، نہ منہ کالا کرتی ہے اس گھر سے، مفت کی روٹیاں مل رہی ہیں، کھا رہی ہے اور اینڈ رہی ہے، حرافہ کہیں کی؟

"نوشابہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، چچی نے ایک تیر اور مارا،
"ہا ہا کیا ناٹک دکھایا جارہا ہے، موئی کمینی کہیں کی! آج میں آخری بار کہے دیتی ہوں، یا تمہ اپنے دھگڑے کا گھر بساؤ جاکے بمبئی میں یا یہیں کسی کے گھر بیٹھ رہو جاکے، ماشاء اللہ جوانی پھٹی پڑ رہی ہے، ابھی سن ہی کیا ہے، ۱۶، ۱۷ سال کی عمر، نک سک سے بھی درست ہو جس جوان کو لنگاوٹ کی نظر سے دیکھو گی وہ رکھ لے گا تمہیں اپنے گھر میں، یہیں تو اب معاف کرو بہت ہو چکی مہمانداری
نوشابہ نے کوئی جواب نہیں دیا، سوا رونے کے،
چچی آج ٹھان کے آئی تھیں کہ دل کی بھڑاس نکال کر رہیں گی انھوں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"یہ بڑے قیمتی آنسو ہیں، انھیں یہاں نہ گنواؤ، ان کی قیمت جوان مرد ادا کر سکتے ہیں مجھ بڑھیا سے کیا پاؤ گی ——— اللہ رکھے اگلے مہینے میری رابعہ کا بیاہ ہونے والا ہے اگر تم یہاں رہیں تو مجھے ڈر ہے کہیں برات نہ لوٹ جائے میرے گھر سے:

اب نوشابہ بولی،
"چلی جاؤں گی چچی!"
انھوں نے فرمایا،
"اے میں قربان! کب وہ مبارک دن آئے گا؟"
"بہت جلد"
"جتنی یہی کوئی سال چھ مہینے میں؟"
"آج کل میں!"
"جس دن جاؤ گی میلاد شریف کروں گی اور مٹھائی بانٹوں گی"

"بس بہت جلد چلی جاؤں گی چچی!"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔"

"صرف ایک درخواست ہے۔"

"درخواست نہیں حکم کہو!"

"کچھ روپے دے دیجیے!"

"کیوں، کیا کرو گی؟"

"راستہ کے خرچ کے لیے!"

"جتنے روپے چاہو لے لو، میں بڑی خوشی سے دوں گی ——— دو چار، پانچ، دس بتاؤ کیا چاہیے؟"

"جو بھی آپ دیں گی بہت ہے!"

چچی نے بٹوہ کھولا، دس کا ایک نوٹ نکالا اور کہا

"یہ لو ——— کل صورت نہ دیکھوں اس گھر میں تمہاری"

"بہت اچھا ایسا ہی ہوگا!"

چچی چلی گئیں اور نوشابہ چارپائی پر بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگی، وہ سوچ رہی تھی، واقعی اب اس گھر میں رہنا میرے لیے مناسب نہیں ہے، گاؤں والے سچ مچ انھیں بھی بدنام کر رہے ہوں گے، اور چچا کا تو باہر نکلنا مشکل ہو گیا ہوگا، چچی یہ بھی سچ کہہ رہی تھیں، اگر میں یہاں رہی تو اس کا اندیشہ بھی ہے کہ رابعہ کی برات آئے اور لوٹ جائے، کیا میں چچا اور چچی کے احسان کا بدلہ یہ دوں کہ ان کی زندگی اجیرن ہو جائے؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، مجھے جانا ہی چاہیے۔ لیکن جاؤں کہاں؟ اس دنیا میں میرا ہے کون؟ کون ہے جو مجھے پناہ دے گا، کون ہے

جو میری فریاد سُنے گا؟ کون ہے جو میری مدد کرے گا؟

خودکشی کیوں نہ کرلوں، پاپ کٹ جائے، مصیبت ختم ہو جائے، لیکن اس ننھی سی معصوم بچی کا کیا کروں؟ اسے کون پالے پوسے گا، اس کی کون رکھوالی کرے گا؟ — نہیں میں نہیں مر سکتی، اس ننھی بچی کے لیے مجھے زندہ رہنا پڑے گا، میں ہر تکلیف اٹھا لوں گی ہر دکھ جھیل لوں گی، ہر مصیبت سہ لوں گی لیکن اپنے جگر کے ٹکڑے کو نہیں مرنے دوں گی اس نے ابھی اس دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے؟ خدا نے اسے اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ مار ڈالوں یا ظالموں کی گود میں پھینک دوں، یہ میرے پاس امانت ہے، خدا کی دی ہوئی امانت محبت کرنے والے مسعود کی بخشی ہوئی امانت، مجھ سے امانت میں خیانت نہیں ہو سکتی، اس کی حفاظت کروں گی، اس کی سیوا کروں گی، خود فاقے کروں گی، اسے اچھے سے اچھا کھلاؤں گی، پہناؤں گی، اڑھاؤں گی،

بڑی دیر تک نوشابہ یہی باتیں سوچتی رہی، پھر اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے بمبئی جانا چاہیے وہاں کی گلی گلی، ناکہ ناکہ، اور محلہ محلہ کا چکر لگاؤں گی، کہیں تو وہ میرا بچھڑا ہوا محبوب مجھے مل جائے گا، ڈھونڈھے سے خدا بھی مل جاتا ہے، پھر مسعود کیوں نہ ملے گا؟ وہ اپنی بچی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوگا، صورت تو اس کی دیکھو، بالکل باپ پر پڑی ہے، ہو بہو بالکل وہی — نہ جانے کیا سوچ کر، نوشابہ نے بچی کو گلے سے خوب بھینچا، اور پھر بے تابی کے ساتھ پیار کرنے لگی۔

اور رات کو ٹھیک بارہ بجے، جب سارا گھر بے خبری کی نیند سو رہا تھا، وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنی کوٹھری سے باہر نکلی، صحن میں آئی گھر کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی، کہاں؟ کدھر؟ کس طرف؟ یہ کون جانے؟ ❊

باب ۱۵

مُسافر خانہ

نوشابہ بمبئی پہنچی چھوٹی سی ندی میں تیرنے والی مچھلی، ایک بے کنارہ وسیع سمندر میں پہنچ گئی، یہاں پہنچتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، کہاں گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکانات، کہاں یہ عظیم الشان شہر، یہاں کی بلند و بالا عمارتیں، یہاں کے شاندار مکانات اور محلات، یہاں کی ٹرام اور بس، یہاں کی وکٹوریہ اور موٹر، یہاں کی بجلی کی ٹرینیں اور لاریاں، یہ سب دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی، اس کے گاؤں میں تھوڑے سے آدمی تھے جن میں سے ہر ایک کو وہ اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی، یہاں آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا، اور کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی، وہاں کی عورتیں لجائی ہوئی شرمائی ہوئی الگ تھلگ رہتی تھیں، یہاں کی عورتیں ننگے سر، ہونٹوں پر سرخی لگائے، نیم عریاں لباس پہنے، موٹروں میں سیر کر رہی تھیں، ٹرام اور بس میں سفر کر رہی تھیں، مردوں کے پہلو میں بیٹھ کر، ران سے ران اور ہاتھ سے ہاتھ ملائے، قہقہے لگاتی تھیں، بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں، مردوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی پارک اور سنیما جاتی تھیں، سڑکوں پر پیادہ اکیلی پھرتی تھیں، یہ منظر دیکھ کر وہ غرق حیرت ہو گئی، اس نے سوچا ہمارے گاؤں کی عورتیں اگر ایسا کریں، تو مرد انہیں کچا چبا ڈالیں،

وہاں کے لوگ، اپنے گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر دبک جاتے تھے، راستہ دے دیتے تھے، کبھی ان پر بُری نظر نہیں ڈالتے تھے، یہاں کے مرد عورتوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے تھے، فقرے سر کرتے تھے، بناتے تھے، موقع ہوتا تھا، آنکھوں سے اشارے کرتے تھے، سینہ پر ہاتھ رکھ کے دردِ دل کا اظہار کرتے تھے، یہ تماشہ دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں کہا، یا اللہ! یہاں کی زمین پھٹ کیوں نہیں جاتی کہ یہ لوگ اس میں سما جائیں، یہاں کے لوگوں پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا کہ ایسے ذلیل لوگوں سے دنیا پاک ہو جائے۔

ننھی بچی گود میں تھی، ہاتھ میں چند میلے کچیلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھی اور ایک نامعلوم منزل کی سمت بڑھی جا رہی تھی، وہ بمبئی تو پہنچ گئی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کہاں جائے؟ کہاں ٹھہرے؟ کہاں سر چھپائے؟

وہ ایک سنسان، فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی، بے سمجھے بوجھے بے جانے پہچانے، نہ معلوم کدھر، نہ جانے کس طرف، کہ اُس نے ایک کرسچین عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا، عمر کوئی ۲۵، ۲۶ سال کی ہو گی، ابھی جوان تھی لیکن مٹاپے نے جوانی کو چھپا دیا تھا، ایک لفنگے نے ان ہندوستانی میم صاحبہ کی طرف دیکھ کر دوسرے لفنگے سے کہا،

"ماشاء اللہ آج کل صحت تو بہت اچھی ہے"

میم صاحبہ کے کان میں الفاظ پڑے اور وہ جھینپ سی گئی، اتنے میں دوسرے نے پہلے سے کہا،

"ارے نظر کیوں لگاتا ہے؟ اتنی منتوں اور دعاؤں کے بعد تو ذرا بوٹی چڑھی ہے بدن پر"

دونوں زور زور سے ہنسنے لگے، اور میم صاحبہ بیچاری، شرمندہ ہو کر آگے بڑھ گئیں

ان کا یہ حشر دیکھ کر، نوشابہ کو اپنی فکر ہوئی، یہ لوگ کہیں مجھے بھی نہ چھیڑیں، اتنے میں ایک اس کی طرف دیکھ کر بولا

"گھر سے بھاگ آئی ہیں شاید!"

دوسرا بولا،

"نہیں نکال دی گئی ہیں میرے خیال ہیں!"

آگے آگے نوشابہ جا رہی تھی، اور اس سے بالکل ملے ہوئے یہ دونوں بدمعاش آپس میں باتیں کرتے چل رہے تھے، باتیں آپس میں کر رہے تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ ذکر نوشابہ کا ہو رہا ہے، وہ بیچاری سہمی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی کہ ایک نے کہا،

"راستہ بھول گئی ہیں بے چاری!"

دوسرا بولا،

"بھٹک گئی ہیں!"

"نہیں یار کسی سے ملنے کا وعدہ ہوگا!"

"ہاں لیکن وہ ملا نہیں، مایوس ہو کر لوٹی جا رہی ہیں؟"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"چہرہ دیکھ لے، سب کچھ لکھا ہوا ہے اس پر!"

"یار اپنا ٹیک ہینڈ کرا دیتے ان سے!"

"خود کر لو!"

نوشابہ نے اپنی رفتار تیز کر دی، یہ لوگ بھی تیز قدموں سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، ایک نے نوشابہ سے کہا،

"ایک نظر اِدھر بھی!"

دوسرا قریب آکر بولا

"اُدھر نہیں اِدھر!"

پہلے نے کہا،

"غلامی کا پرچہ لکھنے کو تیار ہوں!"

دوسرا بولا،

"یہ جھوٹا ہے، مجھ سے لکھوا لو!"

نوشابہ نے اپنی چال اور تیز کر دی، کوئی جواب نہیں دیا، ان دونوں غنڈوں نے بھی قدم بڑھائے، پہلا بالکل اس کے قریب آکر بچی کی طرف دیکھ کر بولا،

"یہ لڑکی کتنی پیاری ہے، لاؤ مجھے دے دو، میں لے لوں اسے گود میں تم تھک جاؤ گی، ناحق کمر بل کھا جائے گی تمھاری!"

دوسرا بڑھا،

"ابے چل ہٹ، دیکھتا نہیں بچی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے —— آؤ بیٹیا آجاؤ میری گود میں!"

یہ کہہ کر اس نے لڑکی کی طرف، گود میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھا ہی دیے لیکن نوشابہ نے بچی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور رونے لگی، اس نے روتے روتے پوچھا،

"تم لوگ کون ہو؟"

"یہ تو ہمیں پہچانتی بھی نہیں!"

دوسرا بولا،

"اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں ہوتی!"

نوشابہ کھڑی ہوگئی، وہ رو رہی تھی اور یہ دونوں غنڈے اُسے چھیڑ رہے تھے اتنے میں ایک تنومند لیکن بوڑھا آدمی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا، اسے دیکھ کر پہلے نے دوسرے سے کہا،

"ابے کوئی آرہا ہے بھاگ!"

"اس نے جواب دیا،

"بھاگیں کیوں بے؟ وہ ہمارا کیا کرے گا، تجھے ڈر لگتا ہے تو بھاگ جا!"

"اتنے میں وہ آدمی قریب آگیا، پہلے آدمی نے نوشابہ سے بلند آواز سے کہا،

"اب ہوچکی لڑائی گھر واپس چلو!"

نوشابہ زور زور سے رونے لگی، وہ آدمی چلتے چلتے ٹھٹک گیا، پہلے غنڈے نے اس کی طرف دیکھے بغیر نوشابہ سے کہا،

"دیر ہو رہی ہے، اب گھر چلو!"

نوشابہ نے کہا،

"تم کون ہے مجھے اپنے گھر لے جانے والا ایک بے بس عورت کو چھیڑنے والا؟"

"او نہو کہہ رہے ہیں غصہ تھوک دو اب، اچھا بھئی غلطی ہوئی ہم سے کان پکڑتے ہیں، اب کبھی تمھیں میکہ جانے سے منع نہیں کریں گے، اب تو چلو!"

نوشابہ نے اس آدمی کی طرف دیکھ کر کہا

خدا کے لیے بچا لیجیے، یہ غنڈہ مجھے پریشان کر رہا ہے!"

آدمی نے غنڈہ سے پوچھا،

"کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ کیا ہوتا، گھر والی ہے، بگڑی ہوئی میکے بھاگی جا رہی ہے!"

نوشابہ نے روتے روتے کہا،

"جھوٹ، میں اسے جانتی بھی نہیں، یہ کون ہے؟ میں تو آج اس شہر میں آئی ہوں، میں کسی کو بھی نہیں جانتی یہاں!"

آدمی نے کڑک کر غنڈے سے پوچھا،

"تم سچ کہہ رہے ہو یہ تمہاری بیوی ہے؟"

"بالکل سچ!"

"ثبوت؟"

"چلو قاضی سے پچھوا دیں!"

"اگر غلط ہوا، تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا!"

"اپنے چھوڑا ایسی بے وفا عورت کو، کیوں پولیس میں دھکے کھاتا پھرے گا!"

وہ بولا،

"ٹھیک کہتے ہو یار، میں نے طلاق دی اسے!"

یہ کہہ کر دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے، نوشابہ کھڑی رہ گئی، اس آدمی نے پوچھا

"تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی

"میں اپنے گاؤں سے آئی ہوں"

"کیوں؟"

"نہیں ڈھونڈھنے!"

"کسے ڈھونڈھنے؟"

وہ لجا گئی، سر جھکا کر اس نے کہا،

"نہیں ——— اپنے سرتاج کو"

"نام کیا ہے اُن کا؟"

"مسعود!"

"کرتے کیا ہیں؟"

"میں نہیں جانتی!"

"رہتے کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم؟"

"پتہ کیا ہے؟"

"یہ بھی نہیں جانتی؟"

"پھر اتنے بڑے شہر میں تم انھیں کیسے ڈھونڈھ لوگی؟"

زرینا بہ نے کوئی جواب نہیں دیا، رونے لگی، بوڑھے کو ترس آگیا، اس نے کہا "بڑی مشکل ہے، اس طرح کیسے پتہ چلے گا ——— تمہارا کوئی اور عزیز ہے یہاں؟"

"کوئی نہیں!"

"تو ٹھہروگی کہاں؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

"میرے ساتھ چلو، جب تک شوہر کا پتہ نہ چلے وہیں رہو!"

نوشابہ اس کے ساتھ ہو لی، لیکن گھر پہنچتے ہی پھر ایک مصیبت سے دو چار ہوئی
بوڑھے آدمی کی بیوی بڑی بدگمان اور تیز مزاج کی عورت تھی، وہ اپنے شوہر کی نگرانی
اس طرح کرتی تھی، جیسے ایک سخت گیر ماں اپنے شریر بچے کی رکھوالی کرتی ہے۔ اُس نے
نوشابہ کو دیکھتے ہی شوہر سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"ایک دکھیاری!"

"یہاں کیوں آئی ہے؟"

"پناہ لینے۔"

پھر اس نے بیوی کو سارا ماجرا از اوّل تا آخر سنا دیا، لیکن وہ مطمئن نہ ہوئی، اس نے کہا،

"یہ نہیں ہو سکتا! —— تمہارا یہ ترڈبس میں نہیں رہ سکتی!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب وطلب کچھ نہیں، صاحبزادی کو لے کر ابھی چلتے بنو، میں اپنے گھر میں سانپ
پالنے سے رہی!"

"بیگم تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہوا مجھے نہیں تمہیں ہے، میں ایک پل بھی اس لڑکی کو اپنے گھر میں نہیں رہنے دینے کی"

"اچھا اچھا، کل میں کوئی دوسرا انتظام کر دوں گا، آج کا دن تو گزر نے دو!"

یہ کبھی نہیں ہو سکتا، اسی طرح ہمدردی ہمدردی میں بہت سے گھر اجڑتے میں نے
دیکھے ہیں!"

"ارے —— تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو!"

کیوں نہ کروں، آخر کو مرد ہو؟"

مرد ہوں، اس لیے بڑھاپے میں بھی قابلِ اعتبار نہیں؟"

"میں اعتبار اور بے اعتباری کے جھمیلے میں کیوں پڑوں، سیدھی سی بات ہے اپنے گھر میں نہیں رکھتی ہیں کسی غیر عورت کو!"

بڑے میاں کافی حد تک زن مرید تھے، گردن جھکا کر انھوں نے نوشابہ سے کہا،

"چلو!"

نوشابہ پھر ان کے ساتھ چل کھڑی ہوئی، وہ دروازہ تک پہنچ چکے تھے کہ بیوی نے آواز دی،

"میں نے کہا سنتے ہو؟"

وہ لوٹ آئے،

"کہو!"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"کسی مسافر خانہ میں ٹھہرا دوں گا اسے!"

ہاں ٹھیک ہے، لیکن بخشو کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ!"

" انھوں نے حیرت سے پوچھا"

"کیوں؟"

"ہماری مرضی!"

بخشو گھر کا کوئی کام کاج کر رہا تھا، بیگم صاحبہ نے اُسے بلایا اور فرمایا،

"کام چھوڑ، ذرا میاں کے ساتھ مسافر خانہ تک چلا جا!"

اصل میں بیگم صاحبہ بختو کو اس لیے ساتھ بھیج رہی تھیں کہ معلوم کر لیں، شوہر صاحب واقعی مسافر خانہ جا رہے ہیں، یا کہیں اور۔

بختو ساتھ ساتھ گیا۔ اور بڑے میاں نے ایک مسافر خانہ میں جس کے منیجر سے کچھ جان پہچان تھی نوشابہ کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ چلتے وقت انھوں نے بختو سے کہا۔

"جا سگریٹ کی ایک ڈبیہ لے آ"

وہ ڈبیہ لینے گیا اور بڑے میاں نے پچاس روپے نوشابہ کے ہاتھ پر رکھے۔

"بیٹی معاف کرنا تمھیں ہمارے گھر کی باتوں سے بڑی کوفت ہوئی ہوگی لیکن ان کا مزاج ہی ایسا ہے، کیا کیا جائے۔ تم یہاں رہو، میں تمھارے شوہر کو ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گا، یہ روپے رکھ لو، ان سے کچھ دن تو کام چل ہی جائے گا آگے کا اللہ مالک ہے!"

نوشابہ نے شکر گزار نظروں سے انھیں دیکھ کر روپے لے لیے، اتنے میں بختو سگریٹ لے کر آ گیا۔ منیجر صاحب بھی پہنچ گئے، چلتے چلتے ان سے بڑے میاں نے کہا،

"یہ ایک مصیبت زدہ لیکن شریف لڑکی ہے، اس کا خیال رکھیے گا، مجھے امید ہے آپ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے!"

مطمئن رہیئے، ایسا ہی ہو گا، ہمارے مسافر خانہ میں تمام مسافروں کا خیال رکھا جاتا ہے، اور کسی کو تکلیف نہیں ہونے دی جاتی!"

نوشابہ آ کر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی، بچی مسکرا رہی تھی، نہ جانے ماں کی تقدیر پر؟ یا اپنے مستقبل پر؟ ٭

باب ۱۶

ایک اور مصیبت

نوشابہ کو مسافر خانہ میں رہتے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے، وہ دن کا بڑا حصّہ مسعود کا کھوج لگانے میں صرف کرتی تھی، اور شام کو تھکی ہاری آکر، اپنی کوٹھری میں پڑ جاتی تھی، اس کا دن گزرتا تھا مسعود کی تلاش میں، اور رات گزارتی تھی اس کی یاد میں، وہ چلتے چلتے تھک کر چور ہو جاتی تھی لیکن ہمت نہیں ہارتی تھی، اسے یہ لگن لگی ہوئی تھی، کہ کسی طرح اپنی جان و دل کے مالک کو ڈھونڈ نکالے، اب تک اس کی دوڑ دھوپ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا، مسعود اب تک لا پتہ تھا، بمبئی کا کونہ کونہ چھان مارا بیچاری نے، لیکن اس کے کاروانِ محبت کا قافلہ سالار نہ ملنا تھا نہ ملا، وہ روتی تھی لیکن اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا، وہ خدا سے دعا مانگتی تھی کہ مسعود مل جائے لیکن شاید اس کی دعائیں آسمان تک پہنچ نہیں پاتی تھیں۔

سب سے بڑی مشکل یہ آ پڑی تھی، کہ پونجی ختم ہو گئی تھی، بڑے میاں نے جو روپے دیئے تھے، وہ صرف ہو چکے تھے، پھر دوبارہ لوٹ کر انھوں نے خبر نہ لی، اب کس کے سامنے وہ ہاتھ پھیلائے؟ اب کس سے وہ مدد کی طالب ہو؟ غیر شہر، غیر لوگ، یہاں کون تھا جو اس کی بپتا پر رحم کھاتا، اور مصیبت میں کام آتا،

وہ خود فاقہ کر سکتی تھی، لیکن ننھی سی جان کا کیا کرے؟ یہ سوال اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا، اور اس کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس مسافر خانہ میں ایک بانکا جوان رہتا تھا، سوداگر تھا، اور روز سینکڑوں روپے کے وارے نیارے کرتا رہتا تھا، وہ نوشابہ کو دیکھ کر مسکراتا، لیکن وہ نفرت سے منہ پھیر لیتی تھی، اس نے مسافر خانہ کی رہنے والی ایک بڑھیا کے ہاتھ ایک روز خط بھیجا، کہ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو، ایک دفعہ مل لو، نہال کر دوں گا، ساری زندگی کے لیے، جو مانگو گی، دوں گا، تمھیں اپنے حسن کی خبر نہیں، میرے دل سے پوچھو، مرا جا رہا ہوں، تمھارے چاند سے مکھڑے پر، اس کی کھوج میں سرگرداں ہو جو تمھیں پوچھتا بھی نہیں، اس کی خبر نہیں لیتیں، جو ہزار جان سے تم پر فدا ہے، مجھے خوش کرو گی تو تمھارے کھوئے ہوئے شوہر کو بھی ڈھونڈ نکالوں گا، بس ایک دفعہ صرف ایک دفعہ مجھے موقع دو کہ میری آنکھیں تمھیں جی بھر کے دیکھ لیں، میرے ہونٹ ــــ،

یہاں تک نوشابہ نے پڑھا تھا، کہ غصہ سے دیوانی ہو گئی، خط کو اس نے پھاڑ ڈالا، ٹکڑے ٹکڑے کیے اور بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ کر کہا،

"لے جاؤ یہی جواب ہے!"

بڑھیا بولی،

"بیٹا، کچھ تو رحم کرو، مجھ سے اس بیچارے کا رونا اور تڑپنا نہیں دیکھا جاتا"

نوشابہ نے جل کر کہا،

"تم چلی جاؤ ایک رات اس کے کمرہ میں!"

بڑھیا نے مسکرا کر اس وار کو سہہ لیا، اور کہا،

"تم خفا ہو گئیں؟"

"ہاں یہ میری حماقت ہے کہ خفا ہو گئی ورنہ کام تو تم نے انعام کا کیا تھا!"

بڑھیا جل گئی،

"آج جوان ہو قدر دان مل رہے ہیں، کل بڑھیا ہو جاؤ گی، کوئی پوچھے گا بھی نہیں؟"

نوشابہ نے جھڑک کر کہا،

"دور ہو جاؤ یہاں سے بند کرو یہ باتیں!"

بڑھیا کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر اس نے کہا،

"اپنا خیال نہیں کرتیں، اپنی بچی کا تو خیال کرو!"

"اور اس کا خیال کرتا کون ہے تم!"

"ارے مجھے کیا پڑی ہے، میں تو تمھارے بھلے کی کہہ رہی ہوں، آخر کب تک یوں اللہ کے بھروسے کام چلے گا، کھاؤ گی کیا، پہنو گی کیا؟ اور اس بچی کا کیا کرو گی؟ کچھ اس کی بھی فکر ہے!"

"ہے تم سے زیادہ ——— میرا سر نہ کھاؤ جاؤ، اب کبھی میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرنا!"

بڑھیا غصہ کے عالم میں اٹھ کر چلی گئی، بیچاری کو دس روپے ملے تھے، سو کا وعدہ تھا، نوشابہ نے اپنی حماقت سے اس کے پورے سو روپے کا نقصان کر دیا تھا۔

لیکن چند روز کے بعد جب نوشابہ کی ننھی اور دلاری بچی بیمار پڑی اور دوا دارو کے لیے بھی اس کے پاس کچھ نہ رہا تو وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی، کیوں نہ اس سوداگر کے بنگلے میں اپنی ماں نہیں حائل کر دوں جا کہ وہ زندگی بھر کے لیے نہال

کر دینے کا وعدہ کرتا تھا، کم سے کم اتنا تو کرے گا، کہ میری بچی کو بچا لے گا، یہ ننھا پھول مرجھانے سے تو بچ جائے گا، اس وقت اگر وہ کٹنی آجاتی، تو ضرور نوشابہ اس کے ساتھ سوداگر کے کمرہ میں چلی جاتی، اور اپنی آبرو اس کے ہاتھ بیچ دیتی جاکر، لیکن کٹنی اس سے خفا تھی اور بغیر اس کی مدد کے وہ سوداگر کے کمرہ میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی، سوداگر نے بھی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرانا چھوڑ دیا تھا مایوس ہو کر، اگر اس وقت وہ ادھر سے گزرتا اور نوشابہ کو دیکھ کر مسکراتا، تو وہ ضرور مسکرا دیتی، وہ اشارے کرتا اور یہ اس کے ساتھ ہو لیتی لیکن وہ بھی اب مایوس ہو کر خاموش ہو چکا تھا، سوچنے لگی رات کا وقت ہے سب لوگ سو رہے ہیں، جاؤں؟ کھٹکھٹاؤں دروازہ؟ وہ دروازہ کھولے تو اسے دیکھ کر مسکرانے لگوں؟ وہ ہاتھ بڑھا کر مجھے اندر گھسیٹ لے، میں چلی جاؤں؟ وہ اندر بلا کر مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لے، میں تھکے ہوئے پنچھی کی طرح گر پڑوں جا کر اس کی گود میں؟ یہ باتیں لاکھ بُری سہی، لیکن میری بچی تو بچ جائے گی؟ لیکن وہ بے خبر پڑا سو رہا ہوگا، میں جاؤں کیسے؟ اسے جگاؤں کیسے؟ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟

یہ سوچتے سوچتے اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی، اپنی بچی کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا، ساری مصیبتوں کی جڑ یہی ہے، اسے بھی مار ڈالوں، خود بھی مر جاؤں۔ اس نے اپنا ہاتھ بچی کے گلے کی طرف بڑھایا، فوراً مسعود کی مسکراتی ہوئی، خوبصورت اور دلفریب تصویر سامنے آکر کھڑی ہو گئی، اس نے کہا،

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

نوشابہ نے دل ہی دل میں کہا،

"اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں؟"

"اسے پالو، اسے پوجو!"

"کس طرح؟"

"دکھ جھیل کر، مصیبت سہ کر!"

"کب تک؟"

"جب تک میں نہ مل جاؤں!"

"کب ملیں گے آپ؟"

"بہت جلد!"

وہی بات جو اس سے پہلے بھی مسعود کی تصویر اس سے کہہ چکی تھی! ایک مرتبہ پھر نوشابہ کے دل کو سکون حاصل ہوگیا، اُسے پھر یقین ہوگیا، میری یہ تپسیا رائیگاں نہیں جائیگی وہ ضرور ایک نہ ایک دن مجھے ملیں گے، اور ان کے ملتے ہی میری تمام کلفتیں اور مصیبتیں ختم ہو جائیں گی، غم کے بادل چھٹ جائیں گے اور خوشی کا چاند چمکنے لگے گا،

انہی خیال آرائیوں میں ساری رات بیت گئی، وہ رات بھر جاگی تھی لیکن تھکن کا ذرا بھی اثر نہ تھا، مسعود کی تصویر نے باتیں کرکے اس کے دل کو ڈھارس دے دی تھی۔

وہ اپنے کمرہ سے نکلی اور سیدھی منیجر صاحب کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ مکھن لگا ہوا نیم گرم توس انڈے کے ساتھ کھا رہے تھے، کیتلی میں کئی پیالیوں کی مقدار میں گرم گرم چائے رکھی تھی، اور وہ سادہ سی ساری انہی کو پہنی تھی، منیجر صاحب نے ناشتہ کرتے کرتے ایک نگاہِ غلط انداز نوشابہ پر ڈالی اور فرمایا،

"کوئی کام ہے؟"

"جی بہت ضروری کام!"

"کہو!"

"اب میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں رہ گیا ہے!"

"میں کیا کر سکتا ہوں!"

"اگر کچھ کر سکتے ہیں تو صرف آپ!"

"تمھیں غلط فہمی ہے بہن، مجھے یہاں سے ساٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے، دو دو بیویاں ہیں کئی بچے، پار سال بارش میں گھر زمین کے برابر ہو گیا تھا، اس سال تین ہزار روپیہ لگا کر پھر سے بنوایا ہے، میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟"

نوشابہ غور سے سنتی رہی منیجر صاحب کی دلچسپ باتیں، پھر اس نے کہا،

"بڑے میاں تو مجھے آپ کے سپرد کر گئے تھے!"

"ہاں تو! —— خود انھوں نے لوٹ کر تمھاری خبر نہ کی تو میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟ — ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مسافر خانہ کا جو کرایہ تم پر چڑھا ہوا ہے، اگر آج ہی کمرہ خالی کر دو، تو معاف کر دوں گا!"

نوشابہ نے کہا،

"میں کمرہ آج ہی خالی کر دوں گی لیکن میرا کوئی بندوبست تو کیجیے!"

منیجر صاحب نے عاجز آ کر کہا،

"میں اپنی مجبوریاں تم سے بیان کر چکا، پھر بھی تم جھاڑ کا کانٹا بن کر میرے پیچھے پڑی ہو، یہ کیا غضب ہے! قسم خدا کی!"

"تو آخر میں کہاں جاؤں؟"

"جہاں سے آئی ہو!"

"یہ نہیں ہو سکتا!"

"آخر تمھارا راز کیا ہے، تم ہو کس فکر میں سمجھ گئیں!"

"نوکر رکھ لیجئے اپنے ہاں!"

"میں نوکر رکھ لوں؟"

"ہاں! کسی طرح آخر کام تو چلے!"

"یہ بھی اچھی کہی، اتنی چھوٹی سی تنخواہ میں، کیا نوکروں کی فوج رکھ لوں، آدھے درجن تو پہلے سے موجود ہیں! —— نابابا، میں بالکل مجبور ہوں، آگیا سمجھ میں؟"

"تو سفارش کر دیجئے کہیں!"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔"

ایک پورا انڈا توس کے لقمہ میں رکھ کر انھوں نے انگلیوں کے شکنجہ میں کسا اور کہا،

"واقعی نوکری کروگی؟"

"جی، کر لوں گی!"

"نوکری تو ہے ایک!"

"تو وہی دلوا دیجئے!"

"کھانا پکا سکتی ہو؟"

"اچھی طرح!"

"میرے خیال میں حاتم سیٹھ کو کھانا پکانے والی ہی کی ضرورت ہے، ناشتہ کر لوں پھر تمھیں خط لکھ دوں گا، چلی جانا، اچھے لوگ ہیں، مزے میں رہوگی!"

نرشابہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،

"لیکن ایک مصیبت اور ہے!"

لاحول ولا قوۃ، تم نے ناشتہ کرنا دوبھر کردیا، کہو اور کیا مصیبت پیش آئی ہے؟"

"نوکری کروں گی تو بچی کیسے پالوں گی؟"

"یہ لیجیے، میں اس کا جواب کیا دوں؟ یہ تم سمجھو!"

لڑکی کو گود میں لیے لیے تو کام نہیں ہو سکتا!"

"بالکل نہیں ہو سکتا، کبھی دال جلا دو گی، کبھی بوٹیاں جھلسا دو گی، کبھی روٹیاں — تم ہرگز ملازمت نہیں کر سکتیں، چھوڑ دو یہ خیال!"

نوشابہ خاموش ہو گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، منیجر صاحب نے ناشتہ ختم کیا، بعد آسا ڈکار لی، توند پر ہاتھ پھیر کر خدا کا شکر ادا کیا، ایک نظر نوشابہ پر ڈالی، کہنے لگے،

"یہ میرا گھر ہے، امام باڑہ نہیں ہے، روتی کیوں ہو؟ ابھی زندگی ہے رو رو کر مجبور کیا جا رہا ہے! —— جب ایسی مجبوریاں تھیں تو تمھیں لڑکی پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ایک طرف ملازمت کرنے کا شوق، دوسری طرف لڑکیاں پیدا کرنے کا شوق، آخر کام چلیگا کیسے؟

نوشابہ کے دل پر چوٹ لگی، آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش اور تیز ہو گئی، یہ دیکھ کر منیجر صاحب جل ہی تو گئے،

"استغفر اللہ —— اسی لیے میں عورتوں سے گھبراتا ہوں، آخر تمھارا منشا کیا ہے؟ تم ملازمت کرو، اور میں تمھاری لڑکی کو کھلاؤں؟ یہ بھی اچھی رہی قسم خدا کے لایزال کی!"

نوشابہ اٹھ کر جانے لگی، دفعتہً منیجر صاحب کو کچھ خیال آیا، انھوں نے آواز دی،

"ذرا سننا تو"

وہ واپس آگئی،

منیجر صاحب نے کہا،

"ایک بات ہو سکتی ہے، اگر تم بُرا نہ مانو؟"

نوشابہ سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگی، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے،

منیجر صاحب نے کہا،

"یا تو میری بات سن لو، یا جی بھر کے رو لو، ہاں نہیں تو!"

نوشابہ نے کہا

"سن تو رہی ہوں!"

منیجر صاحب بولے،

"بچی کو یتیم خانہ میں داخل کرا دوں؟"

نوشابہ نے روہانسی ہو کر پوچھا،

"یتیم خانہ میں؟"

"اور نہیں کیا چیمس کالج میں ——— وہی عورتوں کی ایسی بات، اب گھنٹہ بھر بدشگونی پر روئیں گی، ارے خدا کی بندی، یتیم خانہ میں وہی لڑکے داخل نہیں ہوتے جن کے باپ مر چکے ہوں، وہ بھی داخل ہوتے ہیں جن کے ماں باپ زندہ ہوں لیکن اولاد کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہوں، دور کیوں جاؤ، میری مثال لو، زندہ بیٹھا ہوں لیکن میرے دو بچے یتیم خانہ میں ٹھاٹھ سے پڑھ رہے ہیں ——— اس سے کیا ہوتا ہے ——— لو تو کیا کہتی ہو؟"

نوشابہ نے سوچا موجودہ حالات میں اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں نکل سکتی، فی الحال بچی کو یتیم خانہ ہی میں داخل کر دوں، زندہ تو رہے گی، پل تو جائے گی، یہ سوچ کر بولی،

"یہی سہی!"

قلم دوات کاغذ منگا کر فوراً منیجر صاحب نے دو خط لکھ کر نوشابہ کو دیے، ایک حاتم سیٹھ کے نام دوسرا مسلم یتیم خانہ کے منیجر کے نام، نوشابہ کے ہاتھ میں خط دیتے دیتے پھر واپس لے لیے انھیں پھاڑ کر پھینک دیا، اور کہا،

,,خطوں سے کام نہیں چلے گا، چلو میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ!،،

نوشابہ کو اس فیصلہ سے بڑی ڈھارس ملی منیجر صاحب اسے لے کر یتیم خانہ گئے، وہاں کے منیجر صاحب نے خانہ پری کرتے وقت پوچھا

"بچی کے باپ کا نام!،،

لاحول ولا، آپ بھی لگے بال کی کھال نکالنے لکھ دیجیے، کوئی سا نام بھی، اپنا ہی لکھ دیجیے"

"آپ کا کیوں نہ لکھ دوں ؟"

,,شوق سے ——— ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟،،

"تو آپ اصلی نام کیوں نہیں بتاتے؟"

"ارے صاحب بتا دوں کیا! یہ ٹھہریں عورت، ان کی گردن کاٹ لیجیے، شوہر کا نام نہیں بتائیں گی، آپ مفت میں وقت ضائع کر رہے ہیں، صبغۃ اللہ خاں لکھ لیجیے!،،

منیجر صاحب نے زیادہ بحث فضول سمجھی اور واقعی یہی نام لکھ لیا، نوشابہ کی گود خالی ہو گئی، وہ اپنی ننھی بچی کو بلکتا تڑپتا چھوڑ کر منیجر صاحب کے ساتھ حاتم سیٹھ کی دولت سرا کی طرف روانہ ہوئی، راستہ میں منیجر صاحب نے کہا،

,,تنخواہ ملے تو مسافر خانہ کا بقایا ادا کر دینا، ۲۴ روپے ہوتے ہیں تم پر سمجھیں!،،

"ادا کر دوں گی!،،

حاتم سیٹھ نے نوشابہ کو پندرہ روپے مہینہ اور کھانے پر اپنی لڑکی سلمٰی کی خدمت کے لیے رکھ لیا!

باب ۱۷

سلمیٰ

سلمیٰ تقریباً، نوشابہ کی ہم عمر تھی، شاید سال دو سال بڑی ہو تو ہو، انگریزی فرفر بولتی تھی، جدید فیشن کی رعنائیاں اور زیبائیاں اس پر ختم تھیں، گورا چٹا رنگ، صرف لباس سے معلوم ہوتا تھا ہندوستانی ہے، ورنہ جو دیکھتا یہی سمجھتا کوئی یورپین عورت ہے، وہ گھر میں اپنا وقت بہت کم صرف کرتی تھی، پارٹیوں میں دعوتوں میں تھیٹروں، سینماؤں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں سارا وقت صرف کرتی تھی، وہ بڑی ہنس اور زندہ دل تھی لیکن صرف گھر سے باہر، گھر کے اندر اس سے بڑھ کر چڑچڑا، اور بدمزاج کوئی نہیں تھا، نوکر تو نوکر وہ ماں باپ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی، اور ماں باپ بھی بجائے اس کے کہ اسے دباتے خود دبتے تھے، جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو، اور اب اس کی تلافی اپنی نیازمندی اور فروتنی سے کر رہے ہوں، اس کا کمرہ بالکل الگ تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ بغیر اجازت اس میں داخل ہو سکے، وہ جب چاہتی، ہارمونیم پر بیٹھ جاتی، جب چاہتی ریڈیو سننے لگتی، جب چاہتی گانے لگتی جب چاہتی ہنسنے لگتی، جب چاہتی رونے لگتی، نہ کسی کو آنسو پونچھنے کی اجازت تھی، نہ شریک مسرت ہونے کی، نہ نغمۂ سرود سننے کی، وہ ہنستی تھی تو لوگ اپنا ہنسنا بھول جاتے تھے، وہ روتی تھی تو لوگ سہم جاتے تھے، وہ گاتی تھی تو لوگ خاموش ہو جاتے تھے، وہ خفا ہوتی تھی تو سب پر دہشت

مسلط ہو جاتی تھی، اس کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا، وہ کبھی کبھی دو بجے رات کو مجلس آرائیوں سے فارغ ہو کر واپس آتی، مگر باپ تک میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ پوچھتا بیٹی اتنی دیر کہاں لگا دی؟

نوشابہ کو اپنے اس عجیب و غریب آقا پر حیرت تھی، اس کینڈے کی کوئی عورت اس نے نہیں دیکھی تھی، سب ملازموں کی طرح وہ بھی سلمیٰ کا سامنا بے ضرورت نہیں کرتی تھی، لیکن جب کبھی سامنا ہو جاتا تو وہ اسے بار بار دیکھتی اور دیکھتی رہتی تھی، وہ محسوس کرتی تھی سلمیٰ بہت خوش ہے، بہت آرام سے ہے، دنیا کی کوئی راحت ایسی نہیں ہے جو اسے میسر نہ ہو، لیکن پھر بھی ایک پُراسرار افسردگی اس کے چشم و ابرو پر چھائی رہتی ہے، وہ اس راز کا پتہ لگانا چاہتی تھی، لیکن کس سے پوچھتی؟ بتاتا کون؟ وہ اپنی سکھیوں سہیلیوں میں بلبل کی طرح چہکتی تھی، لیکن جہاں اپنے کمرہ میں اس پر خاموشی چھا گئی، پھر وہ کسی سے مسکرا کر بات نہیں کرتی تھی، جو سامنے آتا تھا چڑھی ہوئی تیوریاں اس کا استقبال کرتی تھیں، بعض وقت تو وہ اپنی بہنوں، اور بھائیوں کو بُری طرح جھڑک دیتی تھی کہ بیچارے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوکروں سے لے کر ماں باپ تک سب سے نفرت کرتی ہے، اور گھر کے باہر ہر ایک کے لیے سراپا اخلاق و محبت ہے گھر میں اس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ پیٹھ پیچھے بھی نوکر اس کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہیں اس نے سن لیا کہیں اسے پتہ چل گیا تو قیامت ہی آجائے گی۔

نوشابہ کو اس گھر میں رہتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے، اس کی بے لوث خدمت اور خاموش اطاعت دیکھ کر رفتہ رفتہ سلمیٰ اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھی اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ گھر میں اگر سلمیٰ کسی سے اچھی طرح پیش آتی تھی تو وہ صرف نوشابہ تھی، لیکن یہ اچھی طرح پیش آنا بھی مستقل نہ تھا، ایسا بھی ہوتا کہ وہ دفعتہً بگڑ بیٹھتی اور خفا ہو جاتی، ایسا معلوم ہوتا

تھا، سیٹھ صاحب کی یہ لڑکی کچھ سنکی ہے، دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے اس کا، جب کبھی وہ بگڑتی تو نوشابہ یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی،

ایک روز خلاف معمول سلمیٰ رات کے گیارہ ہی بجے گھر واپس آگئی، ورنہ بارہ سے پہلے تو کلب گھر سے وہ واپس آتی ہی نہیں تھی، آج ایسا معلوم ہوتا تھا خوش ہے، آج پہلی مرتبہ نوشابہ نے دیکھا تھا کہ وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرہ میں داخل ہوئی، نوشابہ اس کا بستر ٹھیک کر رہی تھی، اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا،

"کیا کر رہی ہے؟"

"بستر ٹھیک کر رہی ہوں آپ کا!"

سلمیٰ آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئی، اُس نے کہا،

"آج میری طبیعت کچھ کسلمند ہے، لیٹوں گی، بتی بجھا دے!"

نوشابہ نے بجلی بجھا دی، اور سبز ہلکی روشنی کا قمقمہ روشن کر دیا، سلمیٰ بستر پر لیٹ گئی

نوشابہ واپس جانے لگی اُس نے پکارا،

"نوشابہ!"

"جی حاضر ہوئی!"

وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی،

"کہاں جا رہی ہے؟"

"کہیں نہیں!"

"نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں تو!"

"تھک زیادہ گئی ہے؟

"جی نہیں کام ہی ایسا کون زیادہ کرنا پڑتا ہے جو تھکوں گی!"

"تو ذرا میرے پاؤں داب!"

نوشابہ پائینتی بیٹھ گئی، سلمیٰ نے پاؤں پھیلا دیئے، اور وہ اس کی پنڈلیوں کو اپنی ران پر رکھ کر آہستہ آہستہ انگلیوں سے مسلنے لگی، بڑی دیر تک سلمیٰ چپ چاپ پڑی رہی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر وہ باتیں کرنے لگی، اس نے پوچھا

"کیوں ری یہ دوسرے تیسرے، گھنٹہ دو گھنٹہ مانگ کر تو کہاں جایا کرتی ہے؟"

"اپنی لڑکی کے پاس اسے دیکھنے!"

سلمیٰ نے حیرت سے پوچھا،

"تیری شادی ہو گئی ہے؟ میں تو سمجھتی تھی تو کنواری ہے —— کہاں ہے تیری لڑکی؟"

"یتیم خانہ میں!"

ایسا معلوم ہوا جیسے یہ خبر سن کر سلمیٰ کو افسوس ہوا، اُس نے کہا،

"چہ چہ، یہ عمر اور بیوہ ہو گی، کب مرا تیرا میاں؟"

نوشابہ نے کہا،

"خدا انھیں سلامت رکھے، میں مر جاؤں وہ زندہ رہیں!"

اب تو سلمیٰ کو اور زیادہ حیرت ہوئی، اس نے پوچھا

"زندہ ہے تیرا شوہر؟"

"جی!"

"کہاں ہے؟"

"یہی تو نہیں معلوم، اسی کو ڈھونڈھنے آئی ہوں اپنے گاؤں سے!"

"وہ یہاں رہتا ہے؟ یہاں کا رہنے والا ہے؟"

"جی!"

"لیکن تجھے پتہ نہیں؟"

"بالکل نہیں!"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— یہ کیوں؟"

"وہ مہینہ بھر کو کہہ کر آئے تھے یہاں، پھر مدت گزر گئی، نہ آئے، نہ خط بھیجا!"

"چھوڑ دیا تجھے؟"

"چھوڑتے کیوں؟ کوئی مجبوری ہو گی بیچارے کو، مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے ———"

سلمیٰ نے بات کاٹ کر کہا،

"بیوقوف کہیں کی ——— مردوں پر اعتبار کرتی ہے!"

"وہ ایسے نہیں تھے!"

سلمیٰ کو ان باتوں میں مزہ آنے لگا تھا، اس نے پوچھا،

"پھر کیسے تھے وہ مہاشہ جی؟"

"بڑے نیک اور سچے!"

"اچھا یہ بتا، کچھ پتہ چلا؟"

"ابھی تو نہیں!"

"کب تک ڈھونڈھتی رہے گی اپنے "انھیں"؟"

"جب تک زندہ ہوں!"

سلمٰی نے زیادہ کریدا، تو نوشابہ نے اسے اپنی سرگزشت کہیں کہیں سے سنا دی، سلمٰی غور سے اس کی دکھ بھری کہانی سنتی رہی، پھر اس نے کہا،

"تم بیوقوف ہے جو اسے ڈھونڈھ رہی ہے، اس نے کوئی اور گھر آباد کر لیا ہوگا،

نوشابہ خاموش رہی، سلمٰی نے پھر کہا،

"یہ مرد بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں، چاہے امیر ہوں یا غریب، جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ!"

نوشابہ نے پوچھا،

"بی بی ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھ!"

"آپ کی شادی کب ہوگی؟"

"میری شادی کب ہوگی؟"

"جی!"

"ہو تو چکی، اور کے دفعہ ہوگی ——— بڑی دھوم دھام سے بیاہ ہوا تھا سارے شہر کے لوگ ٹوٹ پڑے تھے، تحفوں کا ڈھیر لگ گیا تھا اس گھر میں!"

"دولہا میاں کہاں ہیں؟"

سلمٰی نے کچھ سوچ کر کہا،

"جہنم میں!"

یہ بول سن کر نوشابہ کانپ گئی، ایک بیوی اپنے شوہر کے بارے میں یہ بھی کہہ سکتی ہے اس کا اسے وہم وگمان بھی نہ تھا، وہ نہ جانے کیا کیا دولہا میاں کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی، لیکن یہ لفظ سن کر اس کی زبان گنگ ہوگئی،

سلمیٰ نے کہا،

"چپ کیوں ہو گئی، اور پوچھ کچھ!"

"آپ تو اس طرح کہہ رہی، ہیں، اب میں پوچھوں کیا؟"

"تجھے شاید یقین نہیں آیا میری بات کا؟"

"بھلا یقین آنے کی بات ہے بی بی؟"

"سچ وہ جہنم ہی ہیں، اور میں بھی ——— مجھے میرے ماں باپ نے جہنم میں دھکیلا!
اور وہ اپنی طبیعت سے مجبور رہ کر جہنم میں گر پڑے اور گرتے ہی چلے جا رہے ہیں اس میں!"

"خدا نہ کرے!"

"تو یقین کیوں نہیں کرتی میری بات کا ——— دیکھ میں تجھے سارا قصہ سنائے دیتی ہوں!
ماں باپ نے میری شادی ایسے شخص سے کر دی، جو تیرے شوہر سے بھی زیادہ بے وفا
اور لچا تھا، بچپن اسے وراثت میں ملا تھا، اس کا باپ بھی اول درجہ کا بدمعاش اور خود وہ بھی
سب نے ابا اماں کو منع کیا کہ میری شادی اس سے نہ کریں لیکن چھٹیوں میں کالج سے واپس آنے کے
بعد وہ مجھے دیکھ کر ریجھ چکا تھا، اس نے پیام دیا اور میرے دولتمند ماں باپ نے سب کچھ
جانتے ہوئے ایک دولتمند لیکن آوارہ شخص کو میرا شوہر بنا دیا۔
مشکل سے ایک مہینہ وہ ٹھیک رہا ہو گا کہ اپنے رنگ پر آ گیا، وہ دھڑلے سے زندگی
بازی کرتا ہے، آوارگی کرتا ہے، نہ مجھے اپنے پاس رکھتا ہے، نہ خود یہاں رہتا ہے، مسافر کی طرح
سال چھ مہینے میں ایک دو دن کے لیے مارے باندھے آ گیا، مسافروں کی طرح رہا اور چلا گیا
اسی وجہ سے اپنے گھر والوں سے، ماں باپ تک سے نفرت کرنے لگی ہوں، انھوں نے جان بوجھ کر
مجھے اندھے کنوئیں میں دھکیلا، یہ کمرہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے، جب میں یہاں آتی ہوں تو دیوانی

ہو جاتی ہوں، مجھے یاد آجاتا ہے، اسی کمرہ میں وہ میرا شوہر بن کر آیا تھا، محبت کے جام اس نے پئے تھے اور مجھے پلائے تھے، کیا کیا باتیں نہیں، کیسے کیسے دعوے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ فرہاد ہے اور میں شیریں ہوں، میرے بغیر زندہ رہنا اس کے لیے مشکل تھا، مجھے بتاتا تھا کہ تمہاری خاطر میں نے کیسی کیسی حسین لڑکیوں کو چھوڑ دیا ہے، اب ان کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا، میں نادان تھی، یہ باتیں سن کر خوش ہوتی تھی، سمجھتی تھی یہ فخر میرے ہی حصہ میں آیا ہے کہ میرے لیے اس نے بہت سی ماہ پاروں کو چھوڑ دیا ہے، اب وہ دوسری عورتوں کی بغل گرم کرتا ہے، اور ان سے کہتا ہوگا، تم اتنی حسین ہو کہ میں نے تمہارے لیے اپنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ دیا ہے، میں محبت کی لذت سے نا آشنا تھی، اس نے مجھے محبت سکھائی اور جب یہ سبق میں نے سیکھ لیا تو خود بھاگ کھڑا ہوا، اس کمرہ میں یہ ساری باتیں مجھے یاد آتی رہتی ہیں ——— جس طرح تو بیٹھی ہوئی اس وقت میرے پاؤں داب رہی ہے اسی طرح بارہا اس نے میرے پاؤں دابے ہیں، ان پر سر رکھا ہے، انھیں بے اختیار ہو ہو کر چوما ہے، اور تو تو ابھی تھوڑی دیر میں چلی جائے گی، اُس نے رات رات، بھر یہ ناٹک کھیلا ہے، لیکن اب وہ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا، عید بقر عید کو ایک آدھ دن کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے، یہ ایک آدھ دن بھی وہ ایک قیدی کی طرح گزارتا ہے، جیسے قید خانہ میں صرف یہ فکر رہتی ہے کہ وہ کب رہا ہوگا بس ——— میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور گھر سے باہر رہ کر اپنا وقت کاٹتی ہوں لیکن جب اس کمرہ میں پہنچتی ہوں، تو وقت کاٹے نہیں کٹتا، دیوانگی طاری ہو جاتی ہے مجھ پر!"

یہ کہتے کہتے سلمٰی کی آواز بھرا گئی، خود نوشابہ کا یہ عالم تھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی،

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا، اب سلمٰی اپنے جذبات پر غالب آچکی تھی، سنبھل چکی تھی، اس نے کہا،

"کیوں رہی اب تو یقین آیا میری بات کا!"

نوشابہ بولی،

"ہاں ـــــ لیکن وہ رہتے کہاں ہیں؟ کس شہر میں؟"

"وہ یہیں کے رہنے والے ہیں، اپنی کوٹھی میں رہتے ہیں اور مزے کرتے ہیں!"

اتنے میں گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے سلمیٰ نے کہا،

"ارے دو بج گئے باتوں باتوں میں!"

"جی اور کیا!"

"اب تو جا سو رہ!"

"چلی جاؤں گی، ابھی نیند نہیں آتی!"

نوشابہ اور تیزی سے اس کی پنڈلیاں دبانے لگی، سلمیٰ نے کہا،

نہیں اب بہت دیر ہو گئی ہے، میرا کیا میں تو گیارہ بجے دن تک بھی سوتی رہوں، تجھے سویرے اٹھنا ہے، تو جا!"

نوشابہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھی اور اپنی کوٹھری میں چلی آئی، وہ آکر بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن نیند نہ آئی وہ سلمیٰ کی داستانِ غم پر غور کر رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی، سلمیٰ کتنی شاندار حویلی میں رہتی ہے، نوکر، چاکر، دولت کیا نہیں ہے لیکن دل کے سکھ سے وہ بھی محروم ہے، میری طرح! ـــ پھر بھی مجھ میں اور اس میں بہت فرق ہے، اس کی باقاعدہ شادی ہو چکی ہے، اسے خاندان میں ذلیل نہیں ہونا پڑا، وہ کسی حرامی بچہ کی ماں نہیں ہے، اس کے پاس کھانے کو ہے، وہ نوکری پر مجبور نہیں ہے، ہنس بول کر اپنا وقت کاٹتی ہے، اور کاٹ سکتی ہے، اور میں؟ ـــــ

آج پہلی مرتبہ اس نے سوچا کہیں مسعود نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا؟ میرا جوبن لوٹ کر سلمیٰ کے شوہر کی طرح، اب وہ کہیں اور تو مزے نہیں اڑا رہا ہے ـــــ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، میں بھی کیسے پاگل پن کی بات سوچنے لگی، چھی چھی! ؛

باب ۱۸

حسنِ اتفاق!

اب نوشابہ کو، سلمیٰ سے ہمدردی ہو گئی تھی، کچھ اُنس سا ہو گیا تھا، وہ اب سلمیٰ کی سخت گیریوں، اور درشت مزاجیوں سے خفا نہیں ہوتی تھی، رحم کھاتی تھی سلمیٰ اگر توازنِ دماغی سے محروم ہو گئی تھی تو اس کی وجہ تھی معقول اور قابلِ رحم وجہ، اب اس کی سمجھ میں یہ راز بھی آ گیا تھا کہ وہ اپنے باپ سے کیوں خفا ہے اور وہ اس وجہ سے دبتے ہیں، انھوں نے واقعی اپنی بیٹی کو جہنم میں دھکیل دیا، داماد کا انتخاب کرتے وقت مایا دیکھی، روپ دیکھا، گن نہ دیکھا، سبھاؤ نہ دیکھا، لڑکی اپنے شوہر سے محبت چاہتی ہے، دولت نہیں چاہتی، کتنے بدصورت شوہر ہیں جنھوں نے اپنی سچی محبت سے خوبصورت عورتوں کو آئین وفا کا پابند بنا رکھا ہے کتنے کنگال ہیں جنھوں نے اپنی محبت کے جال میں دولتمند لڑکیوں کو گرفتار کر لیا ہے، سلمیٰ کا شوہر ہے، خوبصورت بھی ہو گا، اور دولتمند بھی، لیکن وہ سلمیٰ کی خدمت میں محبت کا تحفہ نہ پیش کر سکا، بیوی شوہر کے بینک بیلنس کو نہیں دیکھتی صرف اس کی چاہ کو دیکھتی ہے، اگر چاہ نہیں ہے، تو دولتِ قارون بھی بیکار ہے۔

نوشابہ کو اس پر بھی حیرت تھی اور سخت حیرت تھی کہ سلمیٰ کے شوہر کو اگر اس سے محبت نہیں تھی تو اس نے محبت کا سوانگ کیوں رچایا؟ وہ جبری اور غیر پسندیدہ شادیوں کی تلخیوں

اور ناکامیوں کو سمجھ سکتی تھی لیکن محبت کے بعد نفرت، اور بغیر کسی وجہ کے نفرت، اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہی وہ نازک منزل تھی جہاں مسعود کے بارے میں بھی شک وشبہ پیدا ہونے لگتا تھا لیکن جس طرح ایک سچا مومن، شیطانی وسوسوں سے عاجز آکر بے تحاشہ لاحول پڑھنے لگتا ہے، اسی طرح نوشابہ اپنے حسن ظن کی تسبیح لے کر بیٹھ جاتی تھی، اور شک وشبہ کے بادل چھٹ جاتے تھے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کرنا نہیں چاہتی تھی کہ مسعود اسے دھوکا دے سکتا ہے؟ اس سے فریب کر سکتا ہے؟ اس کے شباب اور بھرپور جوانی سے کھیل کر اسے بے یار ومددگار چھوڑ سکتا ہے، وہی مسعود جو درخت کے نیچے خودکشی کی دھمکیاں دیا کرتا تھا، جس نے اس کالی اور اندھیری رات میں اس کی سب سے قیمتی پونجی، اپنی محبت اور الفت کے بل پر لے لی تھی، وہ مسعود دھوکا دے، ناممکن، سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن مسعود بے وفا اور دغاباز نہیں بن سکتا۔

آج گھر میں ایک تقریب تھی، سلمیٰ کے چھوٹے بھائی کا غسل صحت، اس موقع پر شہر کے تمام دوست اور عزیز، حاتم سیٹھ نے جمع کر لیے تھے، جو مبارک باد دے رہے تھے اور تحفے پیش کر رہے تھے اور دعوت کے مزے اڑا رہے تھے، گھر میں اطلاع آئی کہ انور میاں یعنی دولہا میاں بھی آئے ہیں، اس خبر سے ایک نئی چہل پہل پیدا ہو گئی، سارے گھر میں آج کتنے دنوں کے بعد انھوں نے اس گھر میں قدم رکھا تھا، تو گھر والوں کا بیان تھا کامل آٹھ مہینے کے بعد!

نوشابہ منتظر تھی کہ دولہا میاں گھر میں آئیں تو انھیں دیکھے لیکن وہ باہر مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے، اور وہاں کسی طرح بھی وہ جا نہیں سکتی تھی۔

وہ سلمیٰ کے کمرہ میں پہنچی کہ دیکھے اس خبر کا اس پر کیا اثر ہوا ہے لیکن وہ بالکل غیر متاثر

عالم میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے اُسے کچھ خبر ہی نہیں، نوشابہ سے ضبط نہ ہو سکا، اُس نے کہا،

"بی بی!"

"ہاں!"

"دولہا میاں آئے ہیں!"

"ہاں مجھے معلوم ہے!"

کوئی خوشی، کوئی سرگرمی، کوئی جوش سلمیٰ کے چہرے پر نہ دیکھ کر نوشابہ مایوس سی ہو گئی کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے کہا،

"یہاں بھی آئیں گے؟"

"کیوں نہیں آئیں گے!"

"تو ذرا اپنا نکھار تو کر لیجیے!"

"کس لیے؟ کیوں؟"

"دولہا میاں جو آئیں گے"

"وہ میرا نکھار دیکھنے نہیں آئیں گے، مجھ سے باتیں کرنے نہیں آئیں گے، دنیا کے دکھانے کو، دنیا کی شرم سے آئیں گے، کچھ دیر گم صم بیٹھے رہیں گے، پھر انھیں کوئی کام یاد آجائے گا، اور کل ضرور آنے کا وعدہ کر کے چلے جائیں گے!"

"نہ جانے دینا، روک لینا اُنھیں!"

سلمیٰ پھیکی ہنسی ہنسی، اُس نے نوشابہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،

"نہ جانے دوں، روک لوں؟"

"ہاں اور کیا!"

سلمیٰ پھر مسکرائی، اس نے کہا،

"تو میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟"

نوشابہ شرما گئی، سلمیٰ نے کہا،

"بول تو میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟ روک لیتی؟"

"ہاں!"

"سچ روک لیتی تو؟"

"ضرور روک لیتی تو؟"

"کس طرح؟"

"ان کا دامن پکڑ لیتی اور کہتی تم نہیں جا سکتے، زندگی بھر نباہنے کا وعدہ کرکے دھوکا نہیں دے سکتے، تم میرے شوہر ہو، میں تمہاری بیوی ہوں، ہم دونوں کو ساتھ ساتھ زندگی بسر کرنا پڑے گی، یا تو تم یہاں رہو یا مجھے اپنے ساتھ لے چلو ——"

"پگلی کہیں کی —— اتنی ساری باتیں کہہ کر بھی تو نہیں روک سکتی تھی اُسے!

"ضرور روک سکتی تھی!"

"طوفان کو کوئی نہیں روک سکتا!"

"طوفان کو طوفان روک سکتا ہے، وہ اگر طوفان بن کر آتے ہیں تو میں بھی طوفان بن کر انھیں پکڑ لیتی!"

"یہ کچھ نہیں ہوپاتا ہے، رکھائی کا تیور دیکھ کر، ہر ارادہ دھرا رہ جاتا ہے، دل بجھ جاتا ہے، حوصلہ پست ہو جاتا ہے، امید مر جاتی ہے، تجھے ابھی تجربہ نہیں ہے نوشابہ، تو نے صرف اپنے شوہر کی جدائی دیکھی ہے، میں نے جدائی بھی دیکھی ہے رکھائی بھی، جدائی امید میں

کاٹی جا سکتی ہے، لیکن کھائی کا ایک لمحہ، جدائی کے سینکڑوں برس سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے کاش تیرے شوہر کی طرح میرا شوہر بھی لاپتہ ہو گیا ہوتا، اور لاپتہ ہو کر جو چاہتا کرتا، پھر میں شاید تیری طرح اس کی یاد میں اپنی زندگی گزار دیتی لیکن جب شوہر رکھائی برتنے لگے، بیزاری کا اظہار کرنے لگے اپنے چہرہ سے، تب ـــــ نفرت ہی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں کی جا سکتی!"

"ایسا نہ کہو بی بی ـــــ محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے، ذرا سی ہیٹی سہی، تم انھیں منالو!"

"منالوں؟"

"ہاں!"

"لیکن وہ مجھ سے خفا کب ہیں؟ میں نے ان کا بگاڑا کیا ہے؟"

"تم نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا یہ سچ ہے لیکن وہ خفا نہ ہوتے تو آنا جانا کیوں چھوڑ دیتے؟" سلمیٰ نے کہا،

"تو بالکل نادان چھوکری ہے نوشابہ، اری بے وقوف، آنا جانا چھوڑنے ہی کے لیے تو وہ خفا ہوئے ہیں ـــــ اگر خوش ہو جائیں گے، تو پھر انھیں آنا جانا پڑے گا، اور اگر ایسا انھوں نے کیا، تو پھر وہاں کیسے جائیں گے جہاں اُن کی راتیں گذرتی ہیں؟ جہاں ہر روز نئے نئے پیمانِ محبت باندھتے ہیں؟"

"آپ انھیں اجازت دے دیں، کہ وہ جو چاہیں کریں، لیکن رہیں گھر ہیں!" سلمیٰ نے بپھر کر کہا،

"میں یہ اجازت ہرگز نہیں دے سکتی ـــــ کیا وہ مجھے اس طرح کی اجازت دے سکتے ہیں؟" نوشابہ نے دانتوں تلے انگلی داب لی، کہا

"ارے کیا بول؟ وہ دے دیں گے مجھے اس طرح کی اجازت؟"

"کہیں عورتوں کو بھی اس طرح اجازت ملتی ہے؟"

"نہیں ملتی ہے تو ملنی چاہیے، کیا ان کے دل نہیں ہوتا؟"

"ہوتا کیوں نہیں؟"

"پھر؟"

"اس "پھر" کا کوئی جواب نوشابہ نے نہیں دیا، اب سلمٰی وہ باتیں کرنے لگی تھی جو اس کی سمجھ سے باہر تھیں، وہ انھیں سمجھ ہی نہیں سکتی تھی، اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"اگر وہ آگئے تو؟

"تو کیا، آئیں گے تو ضرور!"

"پھر تم ان سے کیا کہو گی؟"

"کچھ نہیں!"

"وہ کیا آئیں گے؟"

"خیریت پوچھیں گے، سگریٹ پئیں گے، چائے پئیں گے اور بس!"

"یہی تو تمھاری بھول ہے!"

"وہ کیسے؟"

نوشابہ نے ایک ہمہ دان اور تجربہ کار عورت کی طرح کہا،

"میں بتاؤں؟"

"کیا بتائے گی تو؟"

"ایک بات اگر مان لو!"

"پہلے اپنی بات تو کہہ!"

"وہ خیریت پوچھیں تو رونے لگو!"

"رونے لگوں؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"سنو تو — رونے لگو، جب وہ آنسو پونچھیں، تو کہنا، خود ہی رُلاتے ہو، خود ہی آنسو پونچھتے ہو، ایسی ہی محبت ہے تو یہاں رہتے کیوں نہیں!"

سلمیٰ ہنسنے لگی، اُس نے کہا،

"واقعی نوشابہ تو بڑی بھولی ہے، دنیا کی کوئی بات نہیں جانتی!"

نوشابہ ذرا بگڑ کر بولی

"یہ لو اتنی اچھی تو ترکیب بنائی ہے میں نے، پٹ پڑ جائے تب جانوں!"

سلمیٰ نے کہا،

"بالکل نکمی تدبیر ہے یہ — میں اگر رونے بھی لگوں، تو وہ ہرگز آنسو نہیں پونچھیں گے"

"ہائے اللہ! ایسا بھی ہو سکتا ہے کہیں؟"

"ہو چکا ہے کئی دفعہ!"

نوشابہ لاجواب ہو گئی، اُس نے پھر گفتگو کا رنگ بدلا،

"کب آئیں گے یہاں؟"

سلمیٰ نے مسکرا کر کہا،

"تجھے کیا فکر ہے آنی ان کے آنے کی؟"

"ذرا میں بھی دیکھ لیتی دولہا میاں کو!"

"کیا کرے گی، انہیں دیکھ کر، آدمی ہیں، اور کیا!"

"دیکھتی میری بی بی کے دولہا میاں کیسے ہیں؟ کون اچھا ہے دونوں میں!"

"یہ تو نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا؟"

"تو کیا کرتیں تم؟"

تصویر دکھا دیتی ان کی —— شادی کے ایک مہینہ بعد کی تصویر جب وہ رات دن یہاں رہتے تھے، اور کھسکائے نہیں کھسکتے تھے، جب وہ کہتے تھے، اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی تم سے جدا ہوتا ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے —— ہاتھ میں ہاتھ دے کر میرے ساتھ ہی کھڑے ہیں، وہ بھی مسکرا رہے ہیں، اور میں بھی، شاید وہ میرے انجام پر، اور میں اپنے آغاز پر"

سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، نوشابہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، دونوں خاموش ہو گئیں، دونوں کے دل رو رہے تھے، آنکھیں رو رہی تھیں لیکن زبان خاموش تھی۔

نوشابہ کسی کام سے نیچے آ گئی اور اپنے کام میں لگ گئی، وہ کام کر رہی تھی لیکن اس کا دل سلمیٰ کے پاس تھا اور اس کی بپتا پر کڑھ رہا تھا، اتنے میں ایک دوسری ملازمہ نے اس سے کہا،

"دیکھ دولہا میاں!"

نوشابہ نے جلدی سے کام چھوڑ کر نظر اٹھائی، ایک خوش اندام شخص، ایک شاندار

سوٹ میں ملبوس، اوپر سلمیٰ کے کمرہ کی طرف جا رہا تھا، لیکن وہ نظر کی حد سے نکل چکا تھا، نوشابہ نے جب آنکھ اٹھائی تو وہ آگے بڑھ چکا تھا، وہ صرف اس کی پیٹھ دیکھ سکی، اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی، اپنی اس محرومی پر اسے بڑا افسوس ہوا، کتنے دنوں سے یہ حسرت دل میں لیئے بیٹھی تھی کہ دولہا میاں کی زیارت کرے گی، وہ آئے اور ہوا کی طرح سن سے نکل گئے، حسرت دل ہی دل میں رہ گئی، وہ انھیں بالکل نہ دیکھ سکی، اب کیا جانے کوپ اتریں، اور جاتے وقت بھی کیا جانے دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے؟

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اوپر سے چھوکرا دوڑتا ہوا آیا اور اس نے نوشابہ سے کہا،

"چھوڑ دو یہ کام!"

"ارے واہ رے تیرے کہنے سے چھوڑ دوں؟"

"ہاں! ہم کہہ رہے ہیں!"

"چل ہٹ، جا اپنا کام کر!"

"صاحب چائے پئیں گے، بناتی ہے یا جا کے بیگم صاحبہ سے کہہ دوں؟"

"پھر ٹھیک سے کہتا کیوں نہیں؟ بڑھی بڑھی باتیں کیوں کرتا ہے؟ —— چل میں چائے لے کے آئی!"

چھوکرا چلا گیا، اور نوشابہ چائے بنانے میں لگ گئی، وہ دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی کہ آخر دولہا میاں کو دیکھنے کا موقع مل ہی گیا،

چائے بنا کر نہایت اہتمام سے اس نے ٹرے میں رکھی اور ناشتہ کا دوسرا سامان طشتریوں میں رکھنے لگی، اسی ملازمہ نے جس نے دولہا میاں کی طرف نوشابہ توجہ دلائی تھی کہا،

"ذرا سنبھل کے جانا!"

نوشابہ نے پوچھا،

"کیوں؟"

وہ مسکرائی۔

میرا مطلب ہے کہیں ٹھوکر نہ کھا جانا!"

"ٹھوکر کیوں کھاؤں گی؟

"یہی دلاری بھی کہتی تھی لیکن بُری طرح اُس نے ٹھوکر کھائی، اور گری جا کے صاحب کے قدموں پر!"

"دلاری کون؟"

"تھی ایک تیری ہی طرح کی بھولی بھالی لڑکی!"

کیا ہوا تھا اُس کے ساتھ؟"

صاحب اُسے لے کر چنپت ہو گئے تھے۔ ——— اسی لیے کہہ رہی ہوں ذرا سنبھل کے جانا ٹھوکر نہ کھا جانا!"

نوشابہ کو غصہ آگیا، اُس نے کہا،

"پاگل ہوئی ہے، دولہا میاں کو کہہ رہی ہے؟"

"تو سمجھتی کیا ہے دولہا میاں کو، جو ان کی نظر پر چڑھ جائے اُسے چھوڑتے ہیں بھلا؟"

نوشابہ لرز گئی۔ اُس نے کہا،

"سچ؟"

"یہ لو، میں بھلا جھوٹ بولوں گی اور وہ بھی تجھ سے۔ بی بی کی بات دوسری ہے،

ان سے تو خیر، بولنا ہی پڑتا ہے!،،

،،نوشابہ کا دل دھک دھک کرنے لگا، وہ سوچنے لگی، چائے لے کر جائے یا نہ جائے لیکن دولہا میاں کو دیکھنے کا اشتیاق اس پر غالب تھا، اُس نے ٹرے اُٹھالی اور اللہ کا نام لے کر اوپر بڑھ گئی، جب وہ باورچی خانہ سے نکلی تو اُسی ملازمہ نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کھکھارا، لیکن وہ سنی اَن سنی کر کے اوپر چلی گئی۔

سلمیٰ کے کمرہ کے پاس پہنچ کر نوشابہ نے احتیاطاً دوپٹہ کا اگلا حصہ منہ پر ڈال لیا، دیکھنے کا مقصد گھونگٹ کی آڑ سے بھی پورا ہو سکتا تھا، ایک کرسی پر سلمیٰ بیٹھی تھی، خاموش، افسردہ مغموم، دوسری کرسی پر، دروازہ کی طرف پیٹھ کیے دولہا میاں بیٹھے تھے، نہ جانے خوش یا مغموم، نوشابہ ٹرے لے کر آگے بڑھی میز پر رکھنے سے پہلے اس کی نظر دولہا میاں پر پڑی اور وہ سُن سے ہو گئی، یہ مسعود تھا۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے، سینی مع چائے اور پیالیوں کے زمین پر گر پڑی، دولہا میاں کا سوٹ خراب ہو گیا، پیالیاں ٹوٹ گئیں، سلمیٰ نے بگڑ کر کہا،

"اندھی!،،

نوشابہ اُلٹے پاؤں نیچے واپس آئی، اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے ہوئے اس گھر سے نکل گئی ہمیشہ کے لیے،

وہ آج پھر بمبئی میں ایک اجنبی کی طرح گھوم رہی تھی، تیزی سے چل رہی تھی لیکن ایک نامعلوم منزل کی طرف، خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے؟ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کہاں جا رہی ہے۔۔۔۔۔؟ ❖

باب ۱۹

انور

انور کو سلمٰی کے پاس سے اٹھ آنے کا اچھا بہانہ مل گیا، نوشابہ کے جاتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا،

"لاحول ولا قوۃ سارے کپڑے خراب کر دیے حرامزادی نے!"

سلمٰی نے کہا،

"آپ کو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے، نہ کہ گالیاں دے رہے ہیں بیچاری کو!"

اپنے پتلون کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے اس نے کہا،

"یہ کیوں؟"

"یہ اس لیے کہ اس نے آپ کو یہاں سے فوراً چلے جانے کا موقع مہیّا کر دیا، ورنہ کچھ دیر تو اور آپ کو یہاں بیٹھنا پڑتا!"

انور نے جل کر کہا،

"تمھیں تو طنز و تعریض کے سوا کچھ آتا ہی نہیں!"

سلمٰی بولی،

"ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے!"

انور تلملا اٹھا،

"تم ہر وقت لڑنے پر کیوں آمادہ اور تیار رہتی ہو؟"

"یونہی تفریحاً!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، انور چل گیا

"اب جاتا ہوں!"

"خدا حافظ!"

"پھر آؤں گا کسی دن انشاء اللہ!"

"اللہ اس معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہے! وہ ہمارے آپ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا!"

"کیا مطلب ہے نہ آؤں؟"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہوں، لیکن جس کام کو نہ کرنے کا آپ ارادہ کر چکے ہیں، اسے کرنے کا اعلان کیوں کر رہے ہیں؟"

"گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"اگر بول بھی رہے ہیں، تو یہ کوئی پہلا اتفاق تو نہیں ہے، مرد عام طور پر، اور آپ خاص طور پر جھوٹ بولا ہی کرتے ہیں!"

"اسی لیے میں نہیں آتا، آیا اور تم نے واہیات باتیں شروع کیں!"

انور زور زور سے پاؤں زمین پر رکھتا ہوا چلا گیا، جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا، وہ مسکراتی رہی، جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، وہ رونے لگی، پھر آپ ہی اس نے آنسو پونچھے، اور نوشابہ کو آواز دی، دوسری ملازمہ نے کہا،

"وہ تو نہیں ہے!"

"کہاں گئی؟"

"مجھے تو نہیں معلوم!"

"شاید یتیم خانہ گئی ہو، جب آئے یہاں بھیج دینا!"

ملازمہ چلی گئی، اور سلمیٰ ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی،

انور گھر پہنچا، پھر اس نے کپڑے بدلے، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، اس نے رسیور اٹھایا،

"ہلو، ہلو!"

"کون عشرت؟"

"ہاں میں انور بول رہا ہوں!"

"ضرور آؤں گا! وقت یاد رہے گا نو بجے رات!"

رسیور رکھا تھا کہ ایک بے تکلف دوست احسان آ گیا، اس نے کہا،

"سنا ہے، قاسم سیٹھ تم سے بہت خفا ہیں آج کل"

"کون ابا —— اماں ہاں ان کی تو عادت ہی ہے!"

"کیا عادت ہے؟ باپ پر اعتراض کرتے ہو نالائق کہیں کے!"

"باپ بھی تو قسمت سے وہ ملا، کہ لاکھوں میں ایک، خود بڑھاپے میں جوان عورتوں کو گلے کا ہار بنائے رہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اور ہم جوانی میں اپنا فرض ادا کریں تو نالائق"

احسان نے ایک قہقہہ لگایا

"گویا آپ جو کچھ کرتے ہیں فرض ادا کرتے ہیں؟"

"اور کیا؟"

"نماز نہ پڑھی، عشرت سے مل آئے، ایک قرض نہ ادا کیا، دوسرا ادا کیا، کیوں یہی مطلب ہے نا؟"

"یہی سمجھ لو!"

احسان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"یار ایک بات بتاؤ، لیکن سچ سچ بتانا!"

"پوچھو!"

"تم پر اس بری طرح عورتیں رپجھتی کیوں ہیں؟"

انور نے مسکرا کر کہا،

"یہ ان سے پوچھو!"

"مانتا ہوں کہ خوبصورت ہو، لیکن اتنے بھی نہیں کہ جو دیکھے وہ سجدہ کرنے لگے!"

"نہ سہی لیکن تم کیوں جلتے ہو؟"

"اس لیے کہ ہم پر کوئی عورت آج تک عاشق نہیں ہوئی!"

"منہ دھو رکھو، یہ منہ اور مسور کی دال!"

دونوں ہنسنے لگے،

احسان نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا،

"فہرست میں کچھ اضافہ ہوا؟"

"کیسی فہرست؟"

"مقتولین ناز کی ——— کوئی اور حوا کی بیٹی، ریجھی آپ پر؟"

"کیوں نہیں!"

"کون؟"

کیوں بتائیں؟"

"اس لیے کہ میں تمہاری سوانح عمری لکھنے والا ہوں!"

"میری سوانح عمری کوئی عورت لکھ سکتی ہے، تم نہیں۔"

سامنے الماری رکھی تھی اس کی چھت پر کچھ پرانے رجسٹر، کتابیں، البم رکھے تھے، گرد سے اَٹے ہوئے، ایک چوہا خراماں خراماں ادھر سے گذرا، اس کی رگڑ سے ایک البم جو بالکل کنارے پر رکھا ہوا تھا زمین پر گر پڑا، احسان نے بڑھ کر اُسے اٹھا لیا، اور ورق گردانی کرنے لگا، خود انور کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں اس میں لگی ہوئی تھیں، احسان ایک ایک تصویر غور سے دیکھ رہا تھا، ایک تصویر پر اس کی نظر رُکی، بڑی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا، پھر اُسے انور کے سامنے کر کے پوچھا،

"یہ کون ہے؟"

انور نے مسکرا کر کہا،

"ایک قتیل ناز!"

"یہ بھی؟ یہ آسمانی حور بھی!"

"ہاں! ——— اس کا نام نوشابہ! شاید یہ پہلی لڑکی ہے جو میری طرف نہیں لپکی میں جس کی طرف بڑھا!

"بڑی خوش قسمت ہے!"

میں نے اس سے محبت کی، اسے چاہا، اس سے شادی کا وعدہ کیا ———"

"لیکن ؟"

"لیکن کیا، وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا چھٹیوں میں یہاں آیا، یہاں آنے کے بعد سلمیٰ سے میری شادی ہو گئی عشرت سے پینگ بڑھے، راج کماری نے پھانسا، نرگس نے گھیرا، رفتہ رفتہ نوشابہ کی شکل دھندلی پڑ گئی ! ——— میں تو بھول بھی گیا تھا، آج تم نے یہ تصویر دکھائی تو یہ واقعات یاد آ گئے۔

"پھر اس لڑکی نے پیچھا نہیں کیا ؟"

"نہیں ——— کر بھی نہیں سکتی تھی، وہ مجھے مسعود کے نام سے جانتی ہے، اسے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں بمبئی میں رہتا ہوں، کہاں ؟ یہ اُسے نہیں معلوم !"

"بڑے مزے میں رہے ——— پھر حشر کیا ہوا اُس چھوکری کا ؟"

"مجھے بالکل علم نہیں۔"

"بڑے ظالم ہو یار !"

"ظلم اور رحم اضافی باتیں ہیں، ایک پر ظلم دوسرے پر رحم کا سبب ہوتا ہے میں نے اگر نوشابہ کا دل توڑا، تو نرگس کا دل ٹوٹنے سے بچا بھی لیا، اس کا دل توڑوں گا تو کسی اور نازک دل کا حامی و ناصر بن جاؤں گا !"

"کیا نرالی منطق ہے آپ کی، تم سے بھلا جیت سکتا ہے کوئی ؟"

احسان نے جانے کے لیے ہیٹ اُٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے کہا،

"آج عشرت کے ہاں جلسہ ہے چلو گے ؟"

"کیوں نہیں چلیں گے ؟"

دعوت بھی آئی ہے ؟"

بھی جناب آئی ہے ——— ابھی ابھی ٹیلیفون پر کہہ رہی تھی، نہ آؤ گے تو روٹھ جاؤں گی!"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا ہمیں منانا آتا ہے!"

احسان ہنستا ہوا چلا گیا، اور انور آرام کرسی پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا، پھر اس نے اخبار ایک طرف پھینکا، اور وہی البم اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا، نوشابہ کی تصویر کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا، کبھی وہ البم بند کر دیتا تھا، کبھی کھول لیتا تھا، جب بھی کھولتا تھا، اس کی نظر نوشابہ ہی کی تصویر پر پڑتی تھی جا کر، آج اسے کچھ بھولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں، کچھ پرانے قصے کچھ عہدِ گزشتہ کی داستانیں اس کے دماغ کے پردہ پر گھوم رہی تھیں ایک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کی وفاداریاں اسے یاد آ رہی تھیں، وہ کچھ مضطرب سا ہو رہا تھا ان باتوں کو سوچ کر،

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، وہ مخصوص خیالات کا آدمی تھا، وہ خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا رہتا تھا، وہ وفاداری کو افلاسِ تخیل سے تعبیر کرتا تھا، وہ سمجھتا تھا وفاداری وضعداری اور مسلسل محبت کے معنی ہیں، فکر و نظر کے اضمحلال کے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سوچنے کی، پرکھنے کی، پسند کرنے کی قوت ختم ہو گئی، چاندی بڑی اچھی چیز ہے لیکن اسی وقت تک، جب تک سونا نہ ملے، سونا اچھا ہے لیکن ہیرے کا اور اس کا جب مقابلہ ہو گا، ہیرا بازی جیت لے جائے گا، سچا موتی، ہیرے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے، اس شخص کے بے وقوف ہونے میں کیا شبہ ہے، جو سونے کی اشرفی لینے سے اس لیے انکار کر دے کہ یہ چاندی کا روپیہ میرا پرانا رفیق ہے، جو اپنی وضعداری کا مظاہرہ یوں کرے کہ اشرفی کو ہیرے کی انگوٹھی پر ترجیح دینے لگے، جو اپنی وفاداری کا ثبوت یوں دے کہ سچے موتیوں کا ہار پھینک دے اور ہیرے کی انگوٹھی کو حرزِ جاں بنائے رہے، کم از کم وہ اس نظریہ کا قائل نہیں تھا، وہ

چاندی کا اس وقت تک قدر شناس تھا جب تک سونے سے محروم تھا، ہیرا پاکر وہ سونا کھونے میں کوئی عیب نہیں سمجھتا تھا اور دُرِّ شاہوار کے مقابلے میں وہ جگمگاتے بڑے ہیرے بیچ سمجھنے لگتا تھا،

نوشابہ سے اسی وقت تک اسے محبت تھی، جب تک اس نے سلمیٰ کو نہیں دیکھا تھا اور سلمیٰ کا وہ اسی وقت تک دیوانہ تھا جب تک نرگس سے اس کی آنکھ نہیں لڑی تھی اور نرگس کا وہ اسی وقت تک شیدائی تھا جب تک عشرت نے اُس کے تاروں کو نہیں چھیڑا تھا اور عشرت کا وفادار وہ اس وقت تک تھا، جب تک راج کماری سے اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خوب تر کو پاکر خوب سے نفرت کرنے لگتا تھا نفرت تو وہ کسی جوان عورت سے نہیں کرتا تھا، صرف فرق مراتب ملحوظ رکھتا تھا اور اسی کو وہ اپنا آرٹ سمجھتا تھا، رفتہ رفتہ نوشابہ کی تصویر پر عشرت کی صورت اُبھر آئی، وہ نوشابہ کو پھینک کر اُٹھا، اور "عشرت کدہ" کی طرف چل پڑا، کافی دیر ہو گئی تھی، انتظار ہو رہا تھا اس کا۔

باب ۲۰

رنڈی کا کوٹھا

وقت کے ساتھ ساتھ انور کی عادتوں میں زیادہ پختگی پیدا ہو رہی تھی، اب وہ نوشابہ کو بالکل بھول چکا تھا، گزشتہ چار برس میں ایک مرتبہ بھی وہ نوخیز، الھڑ اور معصوم لڑکی اسے یاد نہیں آئی، جسے دھوکا دے کر وہ بھاگ آیا تھا، سلمٰی کو کس چاؤ سے وہ دلہن بنا کر گھر لایا تھا لیکن وہ اس گھر سے ہجرت پر مجبور ہو چکی تھی، اور اب چار سال سے نہ وہ اس کے گھر گیا تھا، نہ وہ یہاں آئی تھی۔

وہ منچلا اور آوارہ مزاج تھا، مذہب، سماج، خاندان، کسی کا بھی قائل نہیں تھا، اس میں بلا کی کشش تھی کہ جس عورت کو اس نے تاکا سر کر لیا، خواہ وہ کوئی رشتہ دار لڑکی ہو، یا گھر کی ملازمہ یا دوست کی بیوی، شبو گھر کی ملازمہ تھی، اور برابر اس سے فیضیاب ہوتی رہتی تھی سلیمہ پڑوس کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی، دوپہر کی دھوپ یا رات کی تاریکی میں اکثر وہ چھت ہی چھت ہوتی ہوئی انور کے کمرہ میں پہنچتی اور جوانی کے مزے لوٹتی،

زندگی کے مسائل پر انور صرف ایک ہی نقطہ نظر سے غور کرتا تھا، وہ کہتا تھا، زندگی اس لیے نہیں ہے کہ یادِ خدا میں بسر کی جائے، اس لیے ہے کہ خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، نعمتیں اس کے نزدیک صرف دو تھیں، دولت اور عورت ——— سو دولت

وراثت میں ملی تھی، اور عورت؟ وہ کون عورت تھی، جو اُسے دیکھے اور اپنا دامن، تار تار ہونے سے بچالے؟

ایک روز شام کے جھٹپٹے میں وہ گھر سے نکلا، خیال ہوا، کدھر کا رخ کیا جائے، سلمیٰ کا تو سوال ہی نہیں تھا، اسے نہ دیکھے ہوئے مدت ہوچکی تھی، اس کی جاذبیت ختم ہوچکی تھی، وہ بیوی تھی لیکن غیروں سے بدتر، پھر ——— نرگس، راج کماری، عشرت تارا ——— یہ نام باری باری سے اس کے ذہن میں آئے لیکن کثرتِ استعمال سے اب ان میں کوئی ندرت اور جدت نہیں رہ گئی تھی، ان کا خیال کرکے اب دل زور زور سے دھڑکنے نہیں لگتا تھا، ان سے طبیعت سیر ہوچکی تھی، آج کسی نئے چہرے کی تلاش تھی

اسی خیال میں مست اور مگن وہ فرنچ برج کے پاس پہنچا، یہاں وہ دیدۂ شوق کی طرح شاہراہ عام سے ذرا ہٹ کر، پرائیویٹ ٹیکسیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے، وہ ایک ٹیکسی میں جاکر بیٹھ گیا، اس ٹیکسی کے ڈرائیور ابراہیم کو وہ عرصہ سے جانتا تھا، اس نے انور پر ایک نظر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا

"کدھر لے چلوں؟"

"لے چلو کسی طرف لیکن ہو نئی جگہ!"

ہر جگہ نیا مال موجود ہے بیمنگٹن روڈ، گرانٹ روڈ، مزگاؤں، بائی کلہ، تاردیو، جہاں کہیئے!"

"چلو تاردیو کی طرف چلو!"

کار روانہ ہوئی، اور ایک سنسان مقام پر جاکر کھڑی ہوگئی، انور اپنی جگہ بیٹھا رہا اور ابراہیم ایک پرائیویٹ قحبہ خانہ میں داخل ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد، وہ تین عورتوں

کے ساتھ واپس آیا اور اس نے ٹارچ کی روشنی کر دی، وہ تینوں انور کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گئیں، اس نے ایک نظر ڈالی اور ابراہیم سے کہا،

"نہیں بھئی آگے چلو!"

مسکراتے ہوئے چہرے افسردہ ہو گئے، وہ تینوں اتر گئیں اور کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی، انور نے کہا،

"اب مزگاؤں کی طرف!"

کار کا رخ ادھر مڑ گیا، پل سے اتر کر ایک درخت کے نیچے کار رکی، انور بیٹھا رہا ابراہیم ایک بلڈنگ میں داخل ہو گیا، اور چند لمحات کے بعد پھر دو مہ جبینوں کے ساتھ واپس آیا، یہ بھی انور کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئیں، اس نے سگریٹ جلانے کے بہانے ایک نظر ان پر ڈالی، پھر انھیں ٹٹولا، اور ابراہیم سے کہا،

"بائی کلہ چلیں گے بھئی!"

دونوں عورتیں بغیر کسی احتجاج کے کار سے اتر گئیں، اور گاڑی بائی کلہ کی طرف بھاگنے لگی، وہاں پہنچ کر ابراہیم نے اترتے اترتے کہا،

"ابھی آیا!"

اور پھر وہ ایک خوشنما عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا،

انور اطمینان سے بیٹھا ہوا، سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اتنے میں، ابراہیم ایک پری چہرہ کو لے کر نمودار ہوا، وہ آئی اور ایک شاہانہ وقار کے ساتھ آ کر انور کے قریب لیکن اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی، اس مرتبہ انور کو سگریٹ کے بہانہ ماچس جلانے کی ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ ابراہیم نے ٹارچ پھر روشن کر دی تھی، ایک نظر نے ہم نشین پر ڈال کر

براہیم سے کہا،
ٹارچ کی روشنی اندھیرے میں کام آسکتی ہے، یہاں تو خود ہی اجالا پھیلا ہوا ہے
ند کرو اسے اور جاؤ، سامنے ہوٹل میں جا کر چائے پی آؤ!"
ابراہیم مسکراتا ہوا، ہوٹل چلا گیا، بیچارہ تھک گیا تھا، اچھا مال تلاش کرتے کرتے
ب جا کر تیر نشانہ پر لگا تھا،
انور کھسک کر، اور قریب آگیا، وہ ذرا اور پیچھے کو دبک گئی، اُس نے کہا "
آپ بے تکلفی پر مائل نظر آتے ہیں!"
انور نے کہا،
"آپ کو تکلیف اسی لیے تو دی ہے یہاں تک آنے کی!"
"وہ میں سمجھی، لیکن آپ آپ نے سودا تو کیا نہیں!"
آپ کا مطلب شاید فیس سے ہے؟"
"سمجھے تو آپ ٹھیک!"
"فرمائیے کیا نذر کروں؟"
"تکلفات کو چھوڑیئے کام کی بات کیجئے، میں ایک رات کے دوسو روپے لیتی ہوں"
بازار کا عام ریٹ پچاس روپیہ، دوسو سن کر انور ذرا چونکا ہوا، اس نے مسکراتے
ہوئے کہا،
کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!"
وہ ذرا کڑے تیور کے ساتھ بولا۔
آپ سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ مجھے یہ مصنوعی باتیں ناپسند ہیں، فیس میرے حوالے کیجئے

اور جہاں جی چاہے چلیئے، رات بھر میں آپ کی ہوس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی، نہ ہوئی تو کل پھر اگر جیب میں دام ہوں تو آپ آسکتے ہیں!"

آج تک انور نے کسی زن بازاری سے ایسی تنکھی باتیں نہیں سنی تھیں، وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا، اس کے پاس جو اس وقت عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ ایک شعلۂ جوالہ سے کم نہیں تھی، مست آنکھیں، سڈول بازو، بلند و بالا سینہ، متناسب اعضا، گورا رنگ لیکن غضب کی چھب کے ساتھ گداز بدن، ملائم اور ریشمیں بال، سفید رنگ کی ساری میں ملبوس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے دریا میں ہنس بیٹھا ہو، زندگی میں پہلی مرتبہ انور کسی عورت سے مرعوب ہوا، اس نے خاموشی سے دو سو روپے کے نوٹ سامنے بڑھائے اور کہا،

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی مجھے تسنیم کہتے ہیں!"

اس نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے کہا،

"اگر میرے مشورے سے آپ کا نام رکھا جاتا، تو میں قیامت تجویز کرتا!"

تسنیم مسکرائی، اندھیرے میں اس کے سفید دانت یوں چمکنے لگے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی چمک جاتی ہے، اس نے کہا،

"گستاخی معاف، یہ خطاب، تو کچھ آپ ہی حضرات پر زیب دیتا ہے"

"اس عزت افزائی کا شکریہ، لیکن کیوں کر؟ یہ بھی ارشاد فرما دیجیے!

تسنیم نے ایک قیامت کی انگڑائی لی اور کہا،

"چھوڑیئے اس قصہ کو، یہ بحث چھڑی تو ساری رات اسی میں بیت جائے گی!"

"کوئی ہرج نہیں، رات آخر رات اپنی ہی تو ہے!"

اتنے میں ابراہیم چائے پی کر آ گیا، جلتا ہوا سگریٹ اس کے ہاتھ میں تھا، اس نے انور سے پوچھا،

"اب کہاں چلوں؟"

"جوہو!"

گاڑی جوہو کی طرف بھاگنے لگی، انور اور زیادہ تسنیم کے قریب آ گیا، اس مرتبہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن وہ خاموش تھی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو، انور نے کہا،

"یہ تو میں نے اندازہ کر لیا کہ آپ فلسفیانہ طبیعت رکھتی ہیں لیکن فلسفہ پر غور و خوض کسی اور وقت بھی ہو سکتا ہے!"

تسنیم نے کہا،

"آپ کیا چاہتے ہیں؟ اظہارِ محبت شروع کر دوں؟ میں آپ سے کہہ چکی، چھل فریب کی باتیں مجھے نہیں آتیں ہیں ——— بے نتیجہ گفتگو بھی مجھے پسند نہیں ہے؟ آپ نے مجھے رات بھر کے لیے کرایہ پر لیا ہے، آپ مجھے شوق سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن یہ توقع نہ رکھیئے کہ میں آپ کی طرح غلط سلط باتیں کر کے وقتی طور پر بھی آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کروں گی؟"

انور کے پندار پر پھر ایک طمانچہ لگا، وہ سوچنے لگا، میں آج کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں پچاس روپیہ رات پر جن پرائیویٹ قحبہ خانوں کی عورتوں کا میں سودا کیا کرتا تھا، وہ آتے ہی میرے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ جاتی تھیں، بیٹھتے ہی "بخشش" کا تقاضا شروع کر دیتی تھیں گلے میں بانہیں ڈال کر اظہارِ محبت کرنے لگتی تھیں، ساتھ ساتھ شراب پیتی تھیں اور اگر مجھے نشہ میں بدمست دیکھتی تھیں، تو جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی تھیں، لیکن یہ عورت عجیب کینڈے کی واقع ہوئی ہے، نہ سیدھے منہ بات کرتی ہے، نہ خندہ پیشانی سے معاملہ

کی گفتگو سنتی ہے، ایک ہی رات سہی لیکن اس سے نباہ کیوں کر ہوگا، اس کے خوبصورت اور طرحدار ہونے میں شبہ نہیں، یہ بھی سچ ہے، کہ عشرت، تارا، نرگس، راج کماری وغیرہ اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، اسے دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ بس اسے دیکھتے ہی رہو، اس کی باتیں سن کر تمنا ہوتی ہے کہ یہ باتیں کرتی ہی جائے ——— لاحول ولا قوۃ یہ میں کس چکر میں پڑ گیا، سنبھل نہ جاتا تو اس مرض نے حملہ کر ہی دیا تھا جسے بیمار اور کمزور لوگ محبت کے مہیب اور ہولناک نام سے یاد کرتے ہیں۔

اب جو ہو آ چکا تھا، اور کار ایک کاٹیج کے سامنے کھڑی ہوئی تھی، ابراہیم اطمینان سے پچھلی نشست پر لمبی تان کر سونے کے لیے لیٹ گیا، اور یہ دونوں کاٹیج میں رات بسر کرنے کے ارادہ سے داخل ہو گئے۔

جو ہو اور دوسری تفریح گاہوں پر شاندار اور پختہ عمارتیں بھی ہیں، جن کے مکین مستقل طور پر وہاں رہتے ہیں اور دادِ عیش دیتے ہیں، اور صاف ستھری آراستہ پیراستہ جھونپڑیاں بھی ہیں، جن میں کاروان ہوس کے مسافر رات بھر ٹھہرتے ہیں، شراب و شباب سے کھیلتے ہیں، کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد، کوئی ساری رات بسر کر کے صبح کے جھٹپٹے میں واپس چلا جاتا ہے، ان مہذب اور خوش قطع جھونپڑیوں کا کرایہ پانچ روپیہ سے پندرہ روپیہ تک فی رات ہوتا ہے،

انور نے اپنے "خسخانہ" میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا، اور ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر سگریٹ سے شغل کرنے لگا، نسیم وقار اور شائستگی کا مجسمہ بنی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے پہنچی اور مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سامنے میز رکھی تھی، اس پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے،

تسنیم نے شراب کی بوتل دیکھ کر نفرت سے منہ بگاڑا اور کہا،

"کیا آپ شراب بھی پیتے ہیں؟"

انور نے اسے نیم باز آنکھوں سے دیکھا اور گویا ہوا،

"پیتا تو ہوں لیکن شاید آج نہ پیوں!"

"یہ سن کر میں بہت خوش ہوئی لیکن آپ نے ارادہ کیوں بدل دیا؟"

"شراب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی پیئے اور مست ہو جائے اور یہ مقصد بغیر شراب پیئے، صرف آپ کو دیکھ کر حاصل ہو رہا ہے!"

تسنیم نے شائستگی اور سنجیدگی کے ساتھ کہا،

"آپ مانیں گے نہیں!"

"کیا قصور ہوا مجھ سے؟"

"مجھے ان باتوں سے چڑ ہے!"

"لگاوٹ کی باتوں سے؟"

"جی لگاوٹ کی باتوں سے!"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ غیر فطری باتیں ہیں مجھے ہر روز ایسے مردوں سے سابقہ پڑتا ہے جو یہ جان کر مجھے کرایہ پر لیتے ہیں کہ ایک رات سے زیادہ نہیں نبھائیں گے لیکن رات میرے پہلو میں اس طرح گزار دیں گے جیسے وہ مجنوں ہیں اور میں لیلیٰ ہوں!"

"لیکن آپ سب کو ایک ہی لاٹھی سے کیوں ہانکتی ہیں؟"

اس لیے کہ "عاقبت گرگ زادہ گرگ شود"، بھیڑیے کا بچہ بھیڑیا ہی ہوگا، لاکھ

کتے کی طرح دم ہلائے لیکن موقع پائے گا تو کاٹے گا ضرور، اسی طرح مرد مرد بھی سب ایک ہی ہوتے ہیں چاہے خانقاہ میں بیٹھنے والا، صوفی باصفا ہو یا مسجد میں درس دینے والا ملاّ، یا عشرت کدہ میں بیٹھ کر شراب کے جام لنڈھانے والا، آپ جیسا رند!،،

یہ عجیب سی باتیں سن کر انور کے بدن میں جھرجھری سی آئی، اُس نے سنبھل کر کہا،

"آپ مردوں سے اس قدر چڑتی کیوں ہیں؟"

وہ بولی،

"یہ تو ایسا ہی ہوا، جیسے آپ کسی سے پوچھ بیٹھیں، تم سانپ سے گھبراتے کیوں ہو؟"

"آپ کی نظر میں مرد اور سانپ ایک ہیں؟"

"جی بالکل نہیں، چونکہ اس سے ہلکی تشبیہ نہیں ملی، اس لیے سانپ کا ذکر آگیا، ورنہ آپ لوگ اپنے زہریلے پن میں سانپ بیچارے سے بہت آگے ہیں ——— وہ تو صرف ایک مرتبہ ڈستا ہے اور آدمی کا خاتمہ کر دیتا ہے اور یہ زہریلا جانور ——— مرد ——— زندگی بھر ڈستا ہے، پھر مرنے سے بچا لیتا ہے، پھر ڈستا ہے اور اس کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کا تماشا دیکھتا ہے، اور جب وہ مر جاتی ہے تو ڈسنے کے لیے پھر کسی عورت کو دلہن کے پرفریب نام سے لاکر اپنے بل میں بٹھا دیتا ہے! ——— میری یہ باتیں آپ کو بری لگی ہوں گی، لیکن آپ نے خود ہی چھیڑ چھیڑ کر سنا ہے!،،

انور کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا، اس قسم کی باتیں اس نے کبھی کسی کے منہ سے نہیں سنی تھیں ان باتوں میں تلخی ضرورت سے زیادہ تھی لیکن تلخی کے ساتھ ساتھ دلچسپی بھی تھی، انور نے کبھی عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں دی،

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا!

لیکن آج کا کھلونا منہ سے بول رہا تھا، اور ایسے بول بول رہا تھا جو کڑوے ہونے کے باوجود جاذبیت رکھتے تھے، اپنے اندر،

انور نے سوچا، عیاشی، اور شاہد بازی تو روز ہی کرتا رہا ہوں۔ آج ذرا اس عجیب عورت ۔ ایک جوڑ سہی، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے سگریٹ سلگایا اور دھواں اڑانے لگا،

"تو یہ رائے ہے آپ کی ہم غریبوں کے متعلق!"

تسنیم بے رخی سے کہا،

رات بیتی جا رہی ہے یہ بھی یاد ہے، ورنہ باتوں ہی باتوں صبح ہو جائے گی اور پھر آپ اُلٹا دیں گے کہ تسنیم نے الف لیلہ کی شہرزاد کی طرح، ایسا قصہ چھیڑا جو ختم ہونے میں نہیں آتا ــــــ بتی بجھا دوں؟"

بتی بجھانے کے لیے وہ اٹھی، انور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور بولا

رہنے دیجیے ــــــ اندھیرے میں باتیں کرنے کا لطف نہیں۔ آج میں نے طے کر لیا ہے، جی کھول کے آپ سے باتیں کروں گا!"

اور واقعی باتوں باتوں میں صبح ہو گئی، اس کی یہ پہلی رات تھی، جو خالی گئی، تسنیم کو بھی ایسا سنکی گاہک کوئی نہیں ملا تھا جس نے صرف باتیں کر کے رات کاٹ دی ہو۔

جب صبح ہونے لگی، تو انور نے کہا،

"واقعی صبح ہو گئی، چلیے چلیں!"

"چلیئے!"

دونوں تیار ہو کر باہر آئے، انور کو جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں، سارا بدن ٹوٹ رہا تھا اس کا۔ ایک تو رات بھر جاگا، پھر نہ شراب، نہ کباب،

ابراہیم اب تک خراٹے لے رہا تھا، انور کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، اور یہ دونوں آکر پچھلی نشست پر بیٹھ گئے، اور گاڑی انھیں اپنی گود میں لے کر دوڑتی بھاگتی چل پڑی

راستہ میں تسنیم سے انور نے کہا،

آپ کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں، شاید میں انھیں کبھی نہ بھول سکوں،

وہ مسکرائی،

"شکریہ!"

انور نے پھر کہا،

"کیا میں آپ کے گھر آسکتا ہوں؟ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ آپ سے ملنے کی صورتیں پیدا ہوں، میں نے آپ کو جب دیکھا تو زندگی میں پہلی مرتبہ میرا دل دھڑکا میں نے آپ سے باتیں کیں، تو زندگی میں بالکل پہلی بار، میں ان سے متاثر ہوا،

تسنیم بات کاٹ کر بولی،

"شوق سے!"

"ضرور آؤں گا اور آتا رہوں گا!"

"شکریہ اس عزت افزائی کا! ——— لیکن یہ تو بتائیے، عنایتوں کی اتنی بوچھاڑ کیوں ہو رہی ہے اس کنیز پر؟"

کنیز؟ اتنا انکسار بھی مناسب نہیں!"

آپ حقیقت کو انکسار کیوں سمجھتے ہیں؟ میں مبالغہ نہیں کرتی، جھوٹ نہیں بولتی، ہر عورت مرد کے لیے لونڈی ہوتی ہے!"

انور مسکرایا،

"وہ ہوتی ہوگی، لیکن کم از کم تمہاری قوم نہیں!"

تسنیم نے ایک ادائے خاص کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تم لوگ، تو ہم مردوں پر راج کرتی ہو، ہم اپنی بیوی پر، بیٹی پر، بہن پر، جتنے مظالم چاہیں توڑیں، لیکن تم پر ظلم کریں تو جائیں کہاں، کنیز ہو سکتی ہیں وہ نہ کہ تم!"

"جی نہیں، ہم دونوں فرق صرف کم زیادہ کا ہے!"

"میں نہیں مانتا کم از کم تم لوگوں کے بارے میں نہیں مان سکتا!"

"نہیں مان سکتے، یہ الگ چیز ہے، لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"وجہ ظاہر ہے، تم کسی کی پابند نہیں، مجبور نہیں!"

"یہ بات نہیں ہے، ہمیں ایک نہیں بہتوں کی پابندی کرنا پڑتی ہے، میری اماں پرائیویٹ قحبہ خانہ چلاتی ہیں، میں تو ان کی لڑکی ہوں، اور بھی کئی نوجوان عورتیں ہیں —— آیئے گا تو دیکھیے گا —— ہم لوگ عام رنڈیوں سے ممتاز ہیں، کوٹھے پر نمائش کے لیے نہیں بیٹھتے، گھر پر پیشہ نہیں کرتے گاہک موٹروں پر آتے ہیں، ہمارا معائنہ کرتے ہیں، ہمیں ٹٹولتے ہیں آنکھوں آنکھوں میں ہمیں پیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے آگے بڑھ جاتے ہیں، مرضی ہوتی ہے کسی کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، آج سے صدہا برس پہلے جب لونڈیاں بازاروں میں بکتی تھیں، تو ان کا ایک ہی آقا ہوتا تھا، جو انہیں اچھی طرح ٹٹول کر خریدتا تھا اور زندگی بھر نباہ دیتا تھا، ہمارے درجنوں آقا —— نئے نئے روز آتے ہیں، ہمیں ٹٹولتے ہیں، ہمارے بدن کا کساؤ دیکھتے ہیں، نمونہ کے طور پر ہمیں چکھتے ہیں، سواد پاتے ہیں، تو رات بھر کے لیے خرید لیتے ہیں، ورنہ واپس چلے جاتے ہیں —— آپ حیرت سے میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہیں؟ ہاں تو وہ ہمارا اچھی طرح جائزہ لیتے ہیں، جیسے قصائی ذبح کرنے سے

پہلے بکری کا جائزہ لیتا ہے کہ اس میں گوشت زیادہ ہے یا ہڈی؟ چربی زیادہ ہے یا پٹھے، ہم امتحان پر پورے اترے تو خیر، ورنہ انھیں حق ہے کہ ہمیں ناپسند کر کے دوسرے قحبہ خانہ کی طرف بڑھ جائیں، اور وہاں جا کر چھ بکریوں کی پیمائش اور نہاپنی شروع کر دیں، ہم احتجاج نہیں کر سکتے، اپنا معائنہ کراتے رہتے ہیں، بے بسی اور مجبوری کے ساتھ، بعض تو ایسے دلچسپ لوگ ہوتے ہیں جو موٹر میں دو گیلن پٹرول ڈلوا کر دو چار پرائیویٹ قحبہ خانوں کا گشت کرتے ہیں اور اطمینان سے اپنی موٹر میں بیٹھ کر معائنہ ہی معائنہ میں، مفت اپنے دل کی کچھ حسرتیں نکال لیتے ہیں، ہماری مجال نہیں کہ انکار کریں، کیا ایک لونڈی بھی اس سے زیادہ بے بس ہوتی ہے؟"

انور نے طویل گفتگو سن کر کہا،

"دوسروں کو چھوڑو اپنی کہو، کبھی آج تک کسی اندھے نے تمھیں بھی ناپسند کیا ہے؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اب مکرنے کی سند نہیں بھئی، بتاؤ؟"

"نہیں —— پانچ چھ سال کے بعد میں بھی اسی زمرہ میں آجاؤں، آہما پڑے گا مجھے، آخر یہ میرا کس بل، یہ جوبن، یہ نکھار، یہ جوانی، یہ حسن، ہمیشہ تو نہیں رہے گا، میری فیس گرتے گرتے دو سو سے پانچ روپیہ پر آجائے گی میرے قدر دانوں کی لمبی فہرست گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچ جائے گی —— اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ اب ذائقہ بدلوں، تاکہ ذرا فائدہ تو ہو!"

"کیا مطلب؟"

"اماں اب ایکٹرس بنانے والی ہیں مجھے، آمدنی معقول ہوگی گاہک اپنی گوہر کے! گانا تو میں نے اچھی طرح سے سیکھ لیا ہے، ناچ سیکھ رہی ہوں، وہ گورڈائرکٹر صاحب اماں کے پیچھے پڑے ہیں، شاید اگلے مہینہ اگریمنٹ ہو جائے ——

گاڑی رک گئی، تسنیم اتر کر اپنے بالا خانہ چلی گئی، انور گم صم بیٹھا اسے دیکھتا رہا! ٭

باب ۲۱

تیر و نشتر

اور واقعی دس پندرہ روز کے بعد تسنیم کا اگریمنٹ "انڈین فلم لمیٹڈ" سے ہو گیا پانچ ہزار ماہوار تنخواہ، اور اس کے علاوہ متعدد سہولتیں، ایک عالی شان بنگلہ سمندر کے کنارے کمپنی کی طرف سے پیش کیا گیا، نیز ایک خوبصورت اور صبا رفتار موٹر بھی کمپنی نے مفت نذر کر دی اب وہ گمنام پیشہ ور چھوکری نہیں مس تسنیم تھی، اب اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتی تھیں پبلسٹی آفیسر کی طرف سے اس کے حسن و جمال اور فطری اداکاری پر شاعرانہ مقالات شائع ہوتے تھے، وہ جب تک کٹھ خانہ کی زینت تھی. آمدنی بھی کم تھی، کام بھی زیادہ تھا دو سو روپے میں ساری رات اُسے مزدوری کرنی پڑتی تھی، اب آمدنی بہت تھی اور کام بہت کم، اب اس کا درجہ بلند ہو چکا تھا، اب وہ ایکٹرس تھی، اب اس کی کوئی فیس نہیں تھی، بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار صرف امید ہی امید میں ہزاروں روپے کے تحفے اسے دے ڈالتے تھے، زیورات سے بھری ہوئی تجوری اور قیمتی ملبوسات سے لبریز توشہ ، زیادہ تر سیٹھوں اور ساہوکاروں کی فیاضی اور دریا دلی کا نتیجہ تھا، رات کو اب بھی وہ کرایہ پر مل سکتی تھی لیکن اب اس کے دام بہت زیادہ تھے، پہلے وہ سینکڑوں پر سودا کر لیتی تھی، اب وہ ہزاروں سے کم کی بات چیت نہیں کرتی تھی، ابھی اس کی کوئی فلم مارکیٹ میں نہیں آئی تھی لیکن کمپنی کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ

کی طرف سے اس کی تشہیر اتنی ہوئی کہ وہ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ ڈبرا آئی شو، کے دو ایک ڈراموں میں بھی وہ کمپنی کی اجازت سے کبھی کبھی اسٹیج پر آنے لگی، اس کے رقص و نغمہ کے کمالات نے بہت جلد پبلک کا دل موہ لیا، لوگ کہتے تھے، جو عورت اسٹیج پر اس بلا کی اداکاری کر لیتی ہے، وہ اپنی آنے والی فلم "دھڑکن" میں کیا قیامت نہ ڈھائے گی کمپنی اپنی کسی ایکٹرس کو اسٹیج پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی لیکن تسنیم کو دینی پڑی، یہ اس کے ساتھ خاص رعایت تھی،

انور اور تسنیم کے تعلقات روز بروز تیزی کے ساتھ بڑھ رہے تھے، اس نے تارا اور عشرت، نرگس اور راج کماری پر بھی بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا لیکن تسنیم پر تو وہ پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا، اس کے وقت کا بڑا حصہ تسنیم کے گھر پر ہی بسر ہوتا تھا نوشابہ کے بعد وہ تسنیم ہی عاشق ہوا تھا، لیکن وہ ایک نوخیز کلی تھی، یہ ایک کھلا ہوا پھول تھا، وہ ایک کم عمر لڑکی تھی، یہ بھرپور جوانی سے مالا مال عورت تھی، وہ دیہات کی ایک شرمیلی اور الہڑ گزار چھوکری تھی، یہ اسٹوڈیو اور اسٹیج کی باغی اور سرکش، تیز اور طرار، طرحدار اور فتنۂ روزگار معشوق تھی، وہ چاند کی چاندنی تھی، یہ سورج کی دھوپ تھی، چاندنی اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑتی، دھوپ میں کھڑے رہو تو خون کھولنے لگتا ہے، نوشابہ چاندنی تھی جس کا نقش مٹ چکا تھا، تسنیم دھوپ تھی، جس نے انور کے خون کو کھولا دیا، آج وہ نوشابہ کو دیکھتا تو بالکل نہ پہچان پاتا، چھ سات سال کی اس طویل مدت میں، نہ جانے وہ کیا سے کیا ہو گئی ہوگی، لڑکی سے عورت، اور عورت بھی نہ جانے کیسی؟ لیکن تسنیم کو، اب وہ زندگی کے کسی دور میں نہیں بھول سکتا، اس کا نقش اس طرح چھا گیا تھا،

سہ پہر کا وقت تھا، انور اور تسنیم باغیچہ میں بیٹھے ساتھ ساتھ چائے پی رہے تھے

انور نے پیالی ہاتھ میں لیے لیے کہا،

"تم تو اب زمین پر پاؤں نہیں دھرتیں؟"

تسنیم نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا، اور پوچھا،

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"یوں جانا کہ آتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں، تمھارا دیدار ہی نہیں ہوتا!"

تسنیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا!"

انور بھی ہنس پڑا، اس نے کہا،

"پہلا مصرعہ بھی پڑھ دیا ہوتا، ہر روز حسینوں کا دیدار نہیں ہوتا! —— خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، یہ بتاؤ، تمھارا رویہ مجھ سے بدلتا کیوں جا رہا ہے؟"

وہ تیوری چڑھا کر بولی،

"کیا کہا آپ نے؟"

"تم کچھ بدلتی جا رہی ہو؟"

"بالکل نہیں!"

"تم اب وہ نہیں ہو، جو پہلے تھیں!"

"یہ تو ٹھیک ہے، میں اب وہ نہیں ہوں جو پہلے تھی، شاید آپ بھی اب وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے —— یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے، پہلے میں ایک لڑکی تھی، الھڑ، نادان، یہی اپنی معراج سمجھتی تھی کہ آپ جیسا خوبصورت دولہا مل جائے تو ہنسی خوشی زندگی گزار دوں، پھر میں ایک عورت بنی، اور ہر رات مجھے نئے نئے دولہا ملنے لگے، اس حالت میں بھی مگن

تھی، اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں ایک نامور اور نہ کامیاب ایکٹرس ہوں اور دولہا کی تمنا سے بے نیاز! ——— بالکل!"

"لیکن اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے، دوستی بھی تو کوئی چیز ہے!"

"ہاں ہے کتابوں میں!! اور بعض شریف گھرانوں میں! ——— یہ گھر ظاہر ہے شریفوں کا گھر نہیں ہے، اور کتاب نہ میں پڑھتی ہوں، نہ آپ!"

"میرا مطلب ہے، تم کسی کو شوہر نہیں بنا سکتیں نہ بناؤ لیکن دوست، دوست بھی نہیں بنا سکتیں؟"

"کیوں نہیں بنا سکتی، میرے کئی دوست ہیں!"

"کون کون؟"

"آپ کو کیا؟"

میرا نام بھی اس فہرست میں ہے یا نہیں؟!

"توبہ کیجئے، آپ کا نام بھلا کیسے درج ہو سکتا ہے اس میں؟"

"کوئی میری خطا؟ کوئی قصور؟ گناہ؟"

"سب سے بڑی خطا یہ کہ آپ مرد ہیں!"

"اور تم مردوں سے نفرت کرتی ہو کیوں؟"

"بات تو یہی ہے!"

"لیکن یہ تمہاری ساری بہار مردوں ہی کے دم سے تو ہے!"

"کیوں نہیں ——— لیکن میں اس کی قیمت بھی تو ادا کر دیتی ہوں!"

"یعنی؟"

جب بیوقوف تھی، تب شوہر پرست تھی، جب ضرورت مند تھی، تب راتوں کو گرایہ پر جاتی تھی، اب بے نیاز ہوں، لہذا ان سے کھیلتی ہوں ——— تقریباً ہر مرد عورت سے کھیلتا ہے، خواہ وہ اس کی بیوی ہو یا محبوبہ، ایک آدھ عورت ایسی بھی تو ہونی چاہیے جو مرد سے کھیلے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو یا آشنا ——— مجھے آپ وہی عورت سمجھیے!،،

انور کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے گرج کر کہا،

"تو کیا اب تک تم مجھے بیوقوف بناتی رہیں؟"

"یہ آپ نے کیسے سمجھا؟،،

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو آخر؟،،

ایک مرد، خالص مرد، اول و آخر مرد!،،

"بس اس سے زیادہ کچھ نہیں؟"

اس کے بعد باقی ہی کیا رہ جاتا ہے سمجھنے کے لیے؟"

"انور نے غصہ میں کہا،

"بڑے ناپاک خیالات ہیں تمہارے مردوں کے بارے ہیں"

لیکن نئے نہیں ہیں، میری آپ کی جو پہلی رات گزری تھی، اس میں بھی میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر، اپنے خیالات مردوں کے بارے میں ظاہر کر دیئے تھے!،،

"اچھا میں ایک سوال کرتا ہوں!،،

ایک نہیں دو فرمایئے!،،

جب تم مردوں سے اتنی متنفر ہو، تو تم نے شادی کیوں کی، ابھی کہہ چکی ہو کہ کسی زمانہ میں تم شوہر پرست تھیں!،،

ٹھیک ہے ا ـــــ اسی غلطی کی تلافی تو کر رہی ہوں، اپنی بچّی زرینہ کو بھی یہی تعلیم دوں گی کہ مردوں سے کھیلے، ان کا کھلونا نہ بنے !"

"زرینہ؟ کوئی لڑکی بھی ہے تمھاری؟"

"اللہ رکھے کیوں نہیں ہے؟"

"کہاں؟ میں نے تو آج تک اسے نہیں دیکھا!"

"اسے میں نے سینٹ میری ہائی اسکول کے بورڈنگ میں داخل کر دیا ہے !"

"نام تو بڑا اچھا رکھا ہے، زرینہ! عمر کیا ہے اس کی؟"

"کوئی چھ سال کے لگ بھگ ہو گی !"

"اچھا یہ بتاؤ، تمھارا شوہر کہاں ہے؟"

"یہیں بمبئی میں !"

"اس نے چھوڑ دیا تمھیں؟"

"اس نے مجھے چھوڑ دیا! ـــــ"

"شاید آپ کو حیرت ہو رہی ہے !"

"حیرت کی بات ہی ہے وہ کیسا احمق، اور بد طینت شوہر ہو گا جس نے تم جیسی مہ وش اور پری پیکر بیوی کو چھوڑ دیا!"

"آپ جیسا!"

تسنیم نے قہقہہ لگایا، انور بھی ہنس پڑا لیکن فوراً سنجیدہ ہو کر اس نے کہا، "یہ نہ کہو تسنیم، میں تمھارا شوہر ہوتا تو یہ خیالات نہ ہوتے تمھارے مردوں کے بارے میں ـــــ میں تمھیں شوہر پرست بنا دیتا!"

وہ مسکرائی،

"مار مار کے؟"

"نہیں، محبت سے، وفاداری سے، چاہ سے!"

"تو اب بن جایئے!"

"وہ ایک بے خودانہ جوش کے ساتھ چیخا،

"منظور، خدا کی قسم منظور، دیکھو اب پھر نہ جانا، بلاؤں قاضی صاحب کو؟"

"یہ قاضی صاحب ہمارے آپ کے بیچ میں آنے والے کون، مان نہ مان میں تیرا مہمان!"

"مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں شادی تو دل سے ہوتی ہے، ہم یوں بھی میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں!"

"اور کیا!"

"تو میں سمجھ لوں، میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو گئی؟"

"یعنی؟"

"یعنی تم میری ہو گئیں؟"

"شادی کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ میں آپ کی ہو جاؤں؟"

"یہ بھی خوب کہی، پھر کیا معنی؟"

"شادی الگ چیز ہے، پابندی الگ چیز!"

"پھر وہی بے تکی بات، یعنی بیوی بن جاؤں گی مگر پابندی نہ ہوگی؟"

"اور کیا!"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں کہہ رہی ہوں کہ میرے جس سے جو تعلقات ہیں، وہ بدستور رہیں گے!"

"کس قسم کے تعلقات؟"

"جنھیں لوگ "ناجائز تعلقات" سے تعبیر کرتے ہیں اور کس قسم کے تعلقات؟"

انور غصہ سے بے قابو ہو گیا،

"تم بے وقوف بنا رہی ہو مجھے؟"

"جی نہیں، اتنی قابلیت مجھ میں کہاں؟ — میں تو یونہی کھیل رہی تھی آپ سے!"

انور نے سنجیدگی سے کہا،

"شاید ہمارے تعلقات کا یہ آخری دن ہے!"

"میں نے دنوں کا کبھی شمار نہیں کیا، دن اس لیے نہیں ہوتے کہ گنے جائیں، اس لیے ہوتے ہیں کہ گذر جائیں، اور جو کچھ گذر جاتا ہے، میں پھر اس پر غور نہیں کرتی، نہ یاد کرتی ہوں اسے!"

"تمھیں سمجھنا مشکل ہے، بہت مشکل!"

"پھر آپ ذرا بھی ذہین نہیں ہیں —— میں تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں، اگر آپ مجھے بھی نہیں سمجھ سکتے، تو سمجھ کیا سکتے ہیں؟"

"تم ایک معمہ ہو! —— گرہ جسے کوئی کھول نہیں سکتا!"

"میں آپ سے محبت تو نہیں کر سکتی، ہمدردی کر سکتی ہوں، مجھے ہمدردی ہے آپ کے ساتھ!"

"مجھے آپ کی ہمدردی کی ذرا بھی ضرورت نہیں ہے!

تبسم نے گھڑی دیکھ کر کہا،

"اوہ بڑی دیر ہو گئی، اور مجھے ابھی اسٹڈیو جانا ہے، اب اجازت دیجئے، پھر باتیں ہوں گی! ـــــ آپ شاید خفا ہو گئے لیکن میں آپ کو منا لوں گی!"

وہ اٹھی، ملازم سے اس نے کہا، ڈرائیور سے کہو، کار پورٹیکو میں لگا دے۔ انور بھی اٹھ کھڑا ہوا، اتنے میں ۵، ۶ سال کی ایک خوبصورت لڑکی زرق برق لباس پہنے تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی آئی اور تسنیم کے پیروں سے ممی ممی، کہتی ہوئی لپٹ گئی، تسنیم نے اسے گود میں اٹھا لیا، اور پیار کرتے ہوئے پوچھا،

"آج تم کیسے آ گئیں؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آجانا"

"اوہ مجھے یاد نہیں رہا"

تسنیم نے زرینہ کو آہستہ سے اتارا اور کہا،

"بیٹی تم کھیلو، میں اسٹڈیو جا رہی ہوں، تھوڑی دیر کے بعد آؤں گی، اگر دیر ہو جائے تو تم میرا انتظار نہ کرنا، کھانا کھا کے سو رہنا!"

"زرینہ نے یہ ہدایتیں تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور کہا یا تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو، یا تم بھی نہ جاؤ، تسنیم نے محبت بھرے لہجہ میں کہا،

"ضد نہیں کرتے، بُری بات ہے!"

"زرینہ مچل گئی اور رونے لگی، انور اسے ٹکٹکی لگائے، غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے تسنیم سے کہا،

"رو رہی ہے، لیتی جاؤ اپنے ساتھ!"

"یہ وہاں شرارت کرتی ہے، ایک بار کیمرہ توڑ آئی وہاں کا، بڑا قیمتی کیمرہ تھا!"

زرینہ بدستور روئے جا رہی تھی، انور شرارت کا حال سن کر ہنسنے لگا، اُس نے زرینہ کو گود میں اُٹھا لیا اور پیار سے اُس کے گالوں کو تھپکتے ہوئے کہا،

"تمھاری ممی بڑی خراب ہیں، مت جاؤ ان کے ساتھ، چلو ہم تمھیں اپنی موٹر میں سیر کرا لائیں بمبئی کی!"

زرینہ فوراً تیار ہو گئی لیکن تسنیم نے گھور کر اسے دیکھا، وہ پھر رونے لگی، انور نے پوچھا،

"تمھیں اعتراض ہے کچھ؟ نہ لے جاؤں اسے؟"

"کیا کیجئے گا لے جا کے اسے بڑی شریر ہے، آپ کو بھی پریشان کرے گی!"

"کرنے دو، تمھارا کیا ہرج ہے؟"

"ہرج تو نہیں ہے، لیکن یہ دامن پکڑتے پکڑتے پکڑنے لگتی ہے، ایک مرتبہ لے گئے تو ہمیشہ ستایا کرے گی!"

"ستانے دو!"

"ابھی آپ کہہ رہے تھے ہماری ملاقات کا یہ آخری دن ہے، پھر آپ کیوں ایک اجنبی بچہ کو اپنے سے مانوس کرتے ہیں؟"

انور نے زرینہ کو گود میں لیے لیے کہا،

"کہا تو میں نے ضرور تھا، لیکن اپنے قول کو شاید میں نباہ نہ سکوں ـــ کچھ تمھاری وجہ سے کچھ اس بچی کی وجہ سے، بڑی پیاری بچی ہے، مجھے تو اس سے ابھی سے محبت ہوتی جا رہی ہے!"

خدا خیر کرے ـــ میں کہتی ہوں کتنی ڈھٹائی سے آپ لوگ محبت کا نام لے لیتے ہیں معنی بھی معلوم ہیں محبت کے؟"

"سیکھ لوں گا! تم سے!"

"گذر گیا وہ وقت، بوڑھے طوطے کیا سیکھیں گے!——— چل ری زرینہ!"

"ہم تو سیر کو جائیں گے!"

تسنیم کی ماں زہرہ بی بھی آگئی تھیں، انھوں نے محبت بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا،

"تو یہ جانے بھی دو بچہ ہے، گھوم پھر کے آجائے گی ابھی!"

تسنیم نے کہا،

"میں تو جاتی ہوں اماں، تم جانو اور یہ جانے!"

تسنیم موٹر میں بیٹھ کر اسٹوڈیو چلی گئی، زرینہ نے انور کی گود میں چڑھتے چڑھتے کہا،

"ہم جاتے ہیں اماں!"

زہرہ نے اپنی آنکھوں میں محبت کا سمندر بھر کر کہا،

"اے میں قربان تجھے منع کس نے کیا ہے؟"

"ممی نے!"

"بکنے دے اسے!"

"وہ ماریں گی!"

"میں ہاتھ توڑ دوں گی اس کے!"

"نہیں ہاتھ نہ توڑنا ممی کے، پھر میں رونے لگوں گی!"

اور سچ مچ اپنی ممی کے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کا تصور کر کے ننھی زرینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انور نے اسے سینہ سے لگا کر پیار کیا اور تسلی دی،

"یہ تو یونہی کہہ رہی ہیں، بھلا تمھاری ممی کے ہاتھ کون توڑ سکتا ہے؟"

پھر اس نے زہرہ بی سے کہا

"بڑی محبت کرتی ہے یہ لڑکی ماں سے!"

"بہت!____ محبت کرنا تو کوئی بچوں سے سیکھے!"

بیشک! انور نے کہا، اور زرینہ کو گود میں اٹھائے ہوئے باہر کی طرف چل دیا،

انور نے اپنی موٹر پر زرینہ کو بٹھا کر، ورلی، مالابار ہل، میرین ڈرائیو، اپالو، قلابہ، نہ معلوم کہاں کہاں کی سیر کر ڈالی، کئی دوکانوں سے چاکلیٹ، گڑیاں، مٹھائی، کھلونے اور نہ جانے کیا کیا الم غلم چیزوں کا انبار خرید لیا، دفعتہً زرینہ نے، رونا شروع کیا، انور گھبرا گیا، اس نے پوچھا،

"کیا ہوا بیٹی تم رونے کیوں لگیں؟"

وہ روتے روتے بولی،

"ممی!"

"ممی کے پاس چلو گی؟"

اس نے تائید میں گردن ہلا دی، انور نے اسے دلاسا دیا،

چلو، چلتے ہیں!"

انور زرینہ کو لے کر گھر پہنچا، تسنیم بھی اسٹوڈیو سے واپس آ چکی تھی، آج کا پروگرام کسی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا تھا، اس نے زرینہ کے ساتھ اتنی ساری چیزیں دیکھ کر کہا،

"یہ سب کہاں سے لائیں تم؟"

اس نے انور کی طرف انگلی سے اشارہ کیا،

"انھوں نے ___"

انور نے تسنیم سے مسکراتے ہوئے کہا،

"ماں کی ممتا تو سنی تھی، آج لڑکی کی ممتا بھی دیکھ لی"

"کیا ہوا؟ تسنیم نے پوچھا

انور نے ساری داستان دہرائی، تسنیم مسکرا دی، وہ اپنی لڑکی کو دیکھ کر پھول کی طرح کھلی جا رہی تھی، اس نے کہا،

"لڑکی، لڑکوں سے زیادہ محبت کرتی ہے ماں باپ سے!"

انور بولا،

"ایسی پیاری، اور محبت کرنے والی لڑکی کو جس باپ نے چھوڑ دیا، نہ جانے وہ کونسا اُلّو کا پٹھا تھا!"

"ایسی بات آپ ہی کہہ سکتے ہیں، میں نہیں کہہ سکتی!"

"یہ تمھاری شرافت تھی!"

مسکرا کر "شکریہ قدر دانی کا!"

"اب بنانے لگیں مجھے"

"توبہ کیجیے، کانٹوں میں نہ گھسیٹیے!"

"اس وقت تو بوڑھی معلوم ہوتی ہو!

"جی بھاڑے کے ٹٹو کا موڈ کیا؟

"تم اپنی قدر نہیں جانتی تسنیم!"

"پہلے انجان تھی، اب جان گئی ہوں"

زرینہ نے سونے کی فرمائش کی، اور —

باب ۲۲

اسٹڈیو میں

انڈین فلمز لمیٹڈ کا اسٹڈیو بمبئی میں اپنے رنگ کا واحد نگارخانہ تھا، یہاں بیک وقت چار تصویروں کی شوٹنگ ہو سکتی تھی۔ لیبورٹری بھی اپنی موجود تھی، سنسر کے ٹرائل شو، یا ٹریڈ شو کے لیے ایک چھوٹا سا لیکن خوبصورت اور شفاف پکچر ہاؤس بھی موجود تھا، ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے لیے الگ الگ کیبن بنے ہوئے تھے، جن میں وہ فرصت کے اوقات گزارتے تھے، یہاں دوسری کم مایہ فلم کمپنیاں بھی، کرایہ دے کر اپنی فلموں کی شوٹنگ کیا کرتی تھیں، ایک بہت بڑا چمن تھا، جہاں اداکاروں اور فن کاروں کی ٹولیاں وقت گزاری کرتی تھیں، ایک ٹینس کورٹ بھی تھا، جہاں بے کار وقت کو باکار بنایا جاتا تھا، غرض دلچسپی اور ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو انڈین فلمز کے نگارخانہ میں موجود نہ ہو، ہر وقت ایک عجیب چہل پہل اور گھما گھمی کا منظر درپیش رہتا تھا،

انڈین فلمز میں درجنوں ایکٹرسیں کام کرتی تھیں ان میں کچھ مستقل ملازم تھیں اور بعض کا صرف زیر تکمیل فلم کے لیے کنٹریکٹ ہوا تھا، یہ سب جب مل کر بیٹھتی تھیں تو خوب آپس میں چہلیں ہوتی تھیں اور دلچسپ نوک جھونک کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

آج ایک نئی فلم "پری خانہ" کی مہورت تھی، اس میں انتظام کیا گیا تھا کہ زیادہ سے

زیادہ اچھی اور نامور ایکٹرسوں کو جمع کر لیا جائے، چنانچہ متعدد ایسی ایکٹرسوں سے اگریمنٹ کر لیے گئے تھے جو فری لانسر تھیں بعض ایسی ایکٹرسیں بھی تھیں جو دوسری کمپنیوں میں ملازم تھیں لیکن زرکثیر صرف کر کے انھیں مستعار لیا گیا تھا۔

مہورت کی تقریب میں کمپنی کے تمام اداکار موجود تھے، فلم کمپنیوں میں مہورت کے وقت اچھا خاصا ہجوم جمع ہو جاتا تھا، لیکن آج ہجوم عام کے علاوہ حسینانِ شہر کا جھرمٹ بھی تتلیوں کی طرح رقصاں اور ماہِ تمام کی طرح نور افشاں نظر آ رہا تھا، اس جھرمٹ میں کوئی چاند تھا، کوئی سورج، اور سچ پوچھیے تو چاند سورج سے کم کوئی نہ تھا،

وہ دیکھیے بیچ میں ملکۂ حسن بنی ہوئی مس نیلم کھڑی ہیں، باتیں بعد میں کرتی ہیں مسکراتی پہلے ہیں، دُرِ دنداں کی جھلک دور سے نظر آ رہی ہے، شہر میں ان کے حسن و جمال کا شہرہ ہے بڑا اچھا گاتی ہیں، بڑے بڑے لوگ ان کی ایک ایک تان پر سیم و زر کے علاوہ نقد دل نچھاور کیا کرتے ہیں، اور ان کے بالکل سامنے شعلۂ جوالہ بنی ہوئی مس شبنم کھڑی ہیں۔ باتیں کرتے کرتے، کمر کو اس طرح بل دیتی ہیں کہ دیکھنے والے کا دل ڈولنے لگتا ہے جتنی قیمتی ساری زیب تن کیے ہوئے ہیں، اس سے زیادہ قیمتی بلکہ انمول ان کا انداز دلربائی ہے، یہ مسکرانے پر اکتفا نہیں کرتیں، قہقہے بھی لگاتی ہیں لیکن بڑے شیریں اور مترنم، یہ معلوم ہوتا ہے فطرت اپنا ساز بجا رہی ہے، اور اس سے مدبھرے سریلے نغمے نکل رہے ہیں، کوئل کی کوک تو آپ نے بارہا سنی ہوگی، یہ جو مس شبنم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑی ہیں، یہ مس دلاری ہیں، ان کی آواز اور کوئل کی کوک میں ذرا فرق نہیں، نیلم اور شبنم بمبئی کی مانی ہوئی فن کار ہیں، دلاری البتہ نئی ہے۔ اس نے ابھی ابھی فلم کے میدان میں قدم رکھا ہے اور خوب چمک رہی ہے اور بھی متعدد گانے والیاں اور ناچنے والیاں بڑے ٹھاٹھ سے موجود

ہیں۔ ان سب سے ذرا الگ جو بڑی بی کھڑی ہیں، یہ گلاب بائی ہیں، دلاری ان کی ہونہار لڑکی ہے، خود اب پبلک لائف سے ریٹائر ہو چکی ہیں لیکن اپنی قائم مقامی کے لیے انھوں نے دلاری کو تیار کر لیا ہے، یہ اپنی لڑکی کے کمالات دیکھ دیکھ کر مسکرا دیتی ہیں، یا ایک آہ سرد بھر کر کچھ سوچنے لگتی ہیں، مسکراتی اس پر ہیں کہ ان کا یہ جگر کا ٹکڑا، اب کلی سے پھول بن چکا ہے، جس کی خوشبو دور دور تک پہنچنے لگی ہے، اور آہِ سرد کا راز یہ ہے کہ انھیں اپنی جوانی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے جسے سدا بہار سمجھا کرتی تھیں۔

شاید سوچتی ہوں گی، ایک دن ان طرحدار اور البیلی لڑکیوں کا حشر بھی یہی ہوگا ان کے روشن اور تابناک چہرے بھی کمھلا جائیں گے، نئے چاند طلوع ہوں گے، نئے سورج جگمگائیں گے، نئے ستارے نکلیں گے اور ان بے چاروں کو میری طرح کوئی نہیں پوچھے گا، لیکن کیا ان نئے ستاروں میں، جو حسن و جمال کے آسمان پر جگمگائیں گے، میرا کوئی ستارا نہیں ہوگا؟ کیوں نہیں ہوگا! خدا میری بچی کو سلامت رکھے، اس کے پیٹ سے وہ وہ چاند سورج نکلیں گے کہ لوگ بس انہی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کریں گے، حسن تو میرے گھر کی میراث ہے، میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں، تو گھر کے نوکر سے لے کر اماں کے دوستوں تک سب کی آنکھیں مجھی کو ٹٹولنے لگیں، وہ مال زادہ رجبا تو مجھے ابھی تک یاد ہے، جو کہنے کو نوکر تھا لیکن سچ پوچھو تو جوانی کی لہروں کا انجکشن اسی نے دیا تھا مجھے، پھر خدا سلامت رکھے دلاری سے میرے گھر کی رونق بڑھی، سب کہتے تھے، میرے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے لیکن جب جوانی پر آئی، تو آج کون ہے جو اسے سجدے نہ کر رہا ہو گل ہی گی تو بات ہے، استاد جمعہ خاں کہہ رہے تھے، گھر بھر کے کان کاٹے گی آگے چل کر،

گلاب بائی کے ذہن میں یہی باتیں گھوم رہی تھیں کہ اسٹوڈیو میں ہل چل مچی اور لوگ

استقبال کے لیے لپکے، یہ مس تسنیم تھیں، جن کے آتے ہی سب کا رنگ پھیکا پڑ گیا، ایسا معلوم ہوا، جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند چمکنے لگا،

تسنیم ان سب میں نوعمر تھی، اس کی عمر مشکل سے ۲۰، ۲۲ سال کی ہو گی، نگاہ کا ٹھہرنا محال تھا اس کے جگمگاتے ہوئے چہرے پر، ایسا معلوم ہوتا تھا بجلیاں بھری ہوئی ہیں چہرے میں، یہ نیلم، یہ شبنم، یہ دلاری جو رشک آفتاب اور ماہتاب بن کر چمک رہی تھی تسنیم کے سامنے ماند پڑ گئیں، گلاب بائی کو بڑا ناز تھا اپنی دلاری پر، لیکن تسنیم کی چمک دمک دیکھ کر وہ دل ہی دل میں حیران و ششدر رہ گئیں، وہ ڈر رہی تھیں کہیں اس سورج کے سامنے میرا چاند ماند نہ پڑ جائے، وہ اسے گھور گھور کے لیکن حاضرین کی نظریں بچا کے دیکھ رہی تھیں، اس کے سڈول بازو، پتلے پتلے ہونٹ، کھلی کھلی پیشانی، ستواں ناک، گورا رنگ لمبی سی چوٹی دیکھ کر بہت خائف تھیں اور دل میں دعا مانگ رہی تھیں کہ یا اللہ یا تو سب دیدے بٹم ہو جائیں، یا کم از کم تسنیم پر کسی کی نظر نہ پڑے، جو دیکھے، وہ صرف دلاری کو دیکھے.

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد مہورت کی رسم ختم ہوئی، پہلے وہ لوگ رخصت ہوئے جو مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، پھر اسٹاف کے وہ لوگ کھسکے جن کا کوئی پروگرام نہیں تھا، شبنم، دلاری، نیلم وغیرہ بھی رخصت ہوئیں، تسنیم بھی چلی، دلاری نے پوچھا،

"کہاں چلیں؟"

"کہیں نہیں گھر!"

"للہ کبھی ہمارے ہاں بھی چلو پہر دوپہر کے لیے!"

نیلم نے کہا،

"دعوت کرو گی؟"

دلاری نے جواب دیا،

"کیوں نہیں کریں گے انھیں راضی کرلو تم بھی طفیلی بن کر چلی چلو"

شبنم نے کہا،

"اور ہم؟"

"تم بھی" دلاری نے جواب دیا،

فوراً ہی یہ قافلہ دلاری کے گھر پہنچ گیا، گھر کیا تھا جنت کا ٹکڑا تھا، ہر کمرہ بڑے سلیقہ اور اہتمام سے سجا ہوا قیمتی قالین، شاندار مسہریاں، گرانمایہ فرنیچر، ریڈیو، گراموفون، دلچسپی اور زیبائش کی ہر چیز موجود، دلاری تسنیم کو پکڑ کر اپنے کمرہ میں لے گئی، اپنی سہیلیوں شبنم اور نیلم کو بھی ساتھ ساتھ پکڑ لائی تھی، صوفے پر تسنیم کو بٹھا کر وہ اپنا گراموفون اٹھا لائی، اور سہگل کا ایک ریکارڈ بجانے لگی، شبنم نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا،

"توبہ بھئی، نہ جانے یہ ریکارڈ کیوں تمہیں اتنا پسند ہے میرے تو سنتے سنتے کان پک گئے اسے! کوئی اور لگاؤ اچھا سا!"

دلاری نے ریکارڈ پر نظریں جمائے کہا،

"بس کانا بھی چاہے نہ سنئے، کوئی ہم نے باندھ رکھا ہے کسی کو دروازہ کھلا ہوا ہے"

شبنم بولی،

"جاتی ہے ہماری بلا، ہم تو یہیں بیٹھیں گے اور اگر تم نے ریکارڈ نہ بدلا تو ابھی ریڈیو چلاتے ہیں، وہ غل مچے گا کہ ایک بول بھی جو سن سکو تم!"

وہ چلی ریڈیو کی طرف، نیلم نے دامن پکڑا،

"اتنا نہ ستایا کرو بیچاری کو، پھر اس نئے مہمان کا بھی تو خیال کرو کچھ!"

شبنم نے تسنیم کی طرف دیکھا اور بولی،
"مہمان ہے ۔۔۔ کیوں جی، تم مہمان بن کر آئی ہو؟"
دلاری نے باجہ بند کر دیا،
"اب جی بھر کے شور مچا لو، اور جتنی بے بات کی باتیں ہو سکیں کر لو! اب
ہم نہیں خوش، نہیں بجاتے باجہ، لو!"
شبنم بولی
"جب اس کمرہ میں ایک سے ایک گانے والیاں بیٹھی ہوئی ہیں، تو باجہ بجانا حماقت
نہیں تو کیا ہے؟"
اب تسنیم کے بھی لب کھلے،
"ہاں بھئی یہ بھی ٹھیک کہا انھوں نے!"
باجہ پھر سن لیں گے، پہلے اپنا گانا سناؤ!"
دلاری مسکرائی،
"یہ لو، ایک نہ شد دو شد، میں نہیں جانتی گانا وانا!"
شبنم بولی،
"اگر شرم آتی ہو، تو صاف کہہ دو، جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ!"
نیلم نے چھیڑا،
"یہ ٹھہری ایک بے شرم (دونوں ہاتھوں سے سائز بنا کر) بڑے بڑے مردوں
سے تو یہ شرماتی نہیں، تسنیم سے کیا شرمائے گی، نخرے کر رہی ہے، اس وقت!"
شبنم اٹھ کھڑی ہوئی،

"لیکن اس کا علاج ہے میرے پاس!"

سامنے کی الماری میں سے وہ ایک ریکارڈ نکال لائی، اور باجہ کے سامنے بیٹھ کر
اطمینان سے اسے لگانے لگی، دلاری نے کہا،

"اب میں شور مچاؤں گی، ذرا بجا کے تو دیکھو تم!"

"کون منع کرتا ہے، جتنا جی چاہے چیخو، ہمارا کیا ہے تمہارا ہی گلا خراب ہوگا!"

ریکارڈ بجنے لگا، اور اس میں ایک مدھری آواز نکلی، نیلم مسکرانے لگی، دلاری کے
ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا، شبنم نے کہا،

"مچاؤ شور اب خاموش کیوں ہو؟"

دلاری خاموش بیٹھی رہی، شبنم نے تسنیم سے کہا،

"یہ ریکارڈ جانتی ہو کس کا ہے؟"

تسنیم نے انکار میں گردن ہلائی، وہ بولی،

"یہ مس دلاری چھپا رہی ہیں، انہی کا گانا ہے یہ!"

اتنے میں کھٹ سے شبنم نے ادھورا ریکارڈ اتار لیا اور باجہ بند کر دیا، نیلم نے پوچھا

"یہ کیا؟"

شبنم نے بڑی سنجیدگی سے کہا،

"ہماری مرضی!"

تسنیم اپنی جگہ سے اٹھی، اور باجہ کے سامنے آکر بیٹھ گئی، ریکارڈ پھر بجنے لگا ——،

باب ۲۳

توہین

آرائش خانہ میں قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی تسنیم دلفریب حسن کا جائزہ لے رہی تھی، وہ اپنا حسن بے ہمتا دیکھ کر خود دنگ تھی،

انوری نے اس کا نام "قیامت" رکھا تھا اور واقعی وہ تھی بھی قیامت، ۲۰، ۲۲ سال کی عمر، سرو قد، آنکھیں، جیسے شراب سے بھری ہوئی دو کٹوریاں، چہرہ جیسے گلاب کا پھول باتیں دلفریب، آواز فردوس گوش، انداز و ادا،

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

اس کے گانے پر سب سر دھنتے تھے، اس کے ناچ کو دیکھنے والے ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے، اس کی اداکاری، آرٹ اور حقیقت کے ایسے لطیف اور حسین امتزاج کا نمونہ ہوتی تھی کہ جو دیکھتا تھا عش عش کر اٹھتا تھا،

آئینہ میں اس نے اپنے چہرۂ زیبا اور حسن جاں سوز کی بہار دیکھی، ہونٹوں پر بے اختیار تبسم کھیلنے لگا، وہ کیا مسکرائی، ایسا معلوم ہوا ساری کائنات مسکرا رہی ہے، مسکراتے مسکراتے اس نے ایک انگڑائی لی، معلوم ہوا ساری دنیا جھوم رہی ہے،

زہرہ بائی اپنے جھریوں پڑے ہوئے چہرے کے ساتھ نمودار ہوئیں جب کبھی جوان

ہوں گی یہ بھی قیامت صغریٰ سے کم نہ ہوں گی، اس بڑھاپے میں بھی آن بان موجود تھی، بال سفید ہو گئے تھے، چہرہ پر جھریاں پڑ چکی تھیں لیکن ایک رونق سی اب تک باقی تھی، دہکتے ہوئے انگارے جب راکھ بن جاتے ہیں تو بھی چنگاریاں اپنے دامن میں رکھتے ہیں اور ان چنگاریوں کی بجھی بجھی سی چمک بتاتی رہتی ہے کہ یہاں کبھی آگ تھی، انگارے تھے، بھڑکتے ہوئے شعلے تھے، زہرہ بائی کی آگ بجھ چکی تھی، انگارے سرد پڑ چکے تھے، بھڑکتے ہوئے شعلے خاموش ہو چکے تھے لیکن چنگاری کی صورت میں بجھی بجھی سی چمک اب تک ان کے چہرے پر موجود تھی، اور اپنے عہد گذشتہ کی شعلہ سامانیوں کا مظاہرہ کر رہی تھی،

زہرہ نے تسنیم سے کہا،

"تو یہ ہے بیٹی تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔"

تسنیم نے پوچھا،

"کیا ہوا اماں؟

"کتنی دیر سے داور سیٹھ بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں!"

"کیوں؟"

"یہ لو پوچھ رہی ہیں کیوں؟ اگریمنٹ! اگریمنٹ کر لینے آئے ہوں گے اور کیوں؟"

او ہو اب سمجھی، تو وہ مجھے اب اپنے ڈرامہ میں ہیروئن کا کردار دینا چاہتے ہیں شاید!"

"ہاں اور کیا!"

تسنیم ماں کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچی، داور سیٹھ یوسف ثانی بنے ایک صوفے پر بڑی شان سے بیٹھے سگار پی رہے تھے، عمر ساٹھ کے قریب ہوگی، تسنیم کو دیکھ کر سروقد تعظیم کو کھڑے ہوئے اور بغیر کسی وجہ کے مسکرائے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

لیکن تسنیم نے ان کی امیدوں کا قلعہ منہدم کر دیا، وہ نہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی، نہ اُس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس بے رُخی اور سرد مہری کے وار سے ابھی وہ نپٹ نہیں پائے تھے کہ اُس نے کھڑے کھڑے دریافت کیا،

"آپ مجھ سے ملنے تشریف لائے ہیں؟"

"جی بہت اشتیاق تھا آپ کے دیدار کا ——"

"اپنے کسی ڈرامے میں آپ مجھے ہیروئن کا پارٹ ——"

بے تابی سے بات کاٹ کر بولے،

"جی ہاں اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں، سچ تو یہ ہے کہ آپ جس کھیل کی ہیروئن بن جائیں گی اُس میں چار چاند لگ جائیں گے، لوگ دیوانہ وار اس تماشہ کو دیکھنے آئیں گے!"

تسنیم نے کہا،

"شکریہ ادا کرتی ہوں، اس قدر دانی کا، لیکن اگریمنٹ کے شرائط، آپ اماں سے طے کر لیجیے، میں ان معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیتی!"

یہ کہہ کر بغیر جواب لیے وہ واپس چلی گئی، وہ نسیم بہار بن کر آئی تھی لیکن گئی بادسموم بن کر اس طرزِ عمل سے زہرہ بائی بھی کھسیانی ہو گئی اور داور سیٹھ تو اپنی توہین پر باقاعدہ پیچ و تاب کھانے لگے بڑھیا ایک گھاگ تھی، اُس نے سمجھ لیا، شکار ہاتھ سے نکلا چاہتا ہے، بولی،

"بچہ ہے ابھی!"

داور سیٹھ بڑھیا کے ہم عمر تھے اور چچا بھی تھے، وہ بدستور صوفے پر بیٹھے رہے، انھوں نے کہا، "یہ ٹھیک ہے لیکن سوچ لیجیے ترقی کا یہی زمانہ ہے، یہ بچپن میں ضائع ہو گیا تو ترقی کب کریں گی آپ کی عمر کو پہنچ کر ۔ — ان کی نظم نہ جانے کب مکمل ہو کر مارکیٹ میں آئے، میں ایک ڈرامائی شو

میں ان کا جوہر دیکھ چکا ہوں، چاہتا ہوں دنیا ان کا لوہا مان جائے، یہ اسٹیج پر آ گئیں تو چند ہی روز میں شہرت کے آسمان پر سورج کی طرح چمکنے لگیں گی، میں اگر ان کے ذریعہ کچھ کماؤں گا تو تمھیں بھی فائدہ ہی پہنچے گا۔ ——— کمپنی سے کیا تنخواہ ملتی ہے؟

"ابھی تو پانچ ہزار ملتے ہیں، لیکن ہیچر بن جانے کے بعد ترقی کا وعدہ ہے!"

"بس: ——— کام کتنا پڑتا ہے"

"کام کی کیا پوچھتے ہو سیٹھ صاحب، نہیں ہے تو کئی کئی دن گھر بیٹھی ہیں، ہے تو لگاتار، دن رات اسی میں لگی ہوئی ہیں!"

سیٹھ صاحب نے فیصلہ کن انداز میں سگار کو اپنے مصنوعی دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے کہا

"میں چھ ہزار ماہوار دوں گا!"

زہرہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا،

"چھ ہزار؟"

"ہاں چھ ہزار دوں گا اور کام بہت کم لوں گا،"

زہرہ کو اور حیرت ہوئی، اس نے بے تاب ہو کر پوچھا،

"کام بہت کم؟"

"ہاں، ہفتہ میں صرف دو بار، دو گھنٹہ کے لیے انھیں اسٹیج پر آنا پڑے گا!"

"بس اتنا کام!"

"ہاں، صرف اتنا!"

زہرہ کے منہ سے رال ٹپکنے لگی، لیکن ضبط کر کے اس نے کہا،

"اور کمپنی کا کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا وہاں کی نوکری چھوڑنی پڑے گی اسے؟"

"ہرگز نہیں! میری طرف سے اجازت ہو گی!"

اب زہرہ فیصلہ کن انداز میں بولی

"ہم راضی ہیں، جب چاہو اگریمنٹ کر لو!"

"اسی لیے تو آیا تھا لیکن آپ کی صاحبزادی تو بچپن کر کے چلی گئیں، اگریمنٹ کروں کس سے؟ آپ سے؟"

"اچھا تو کل آیئے!"

"بار بار آنے کی مجھے فرصت نہیں، ہوگا تو آج اور ابھی ورنہ کبھی نہیں!"

بڑھیا دہل گئی، چھ ہزار ماہوار کا نقصان کیسے برداشت کر سکتی تھی، اس نے کہا،

"اچھا تو ہم آجائیں گے آپ کے دفتر میں!"

سیٹھ صاحب اس پر بھی راضی نہیں ہوئے، انھوں نے کہا،

"یہ بھی نہیں ہو سکتا!"

بڑھیا اب رونے کے قریب تھی، اس نے پوچھا،

"کیوں؟"

"میں نے کہہ دیا، ہوگا تو آج، ورنہ کبھی نہیں ــــــ میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا عادی نہیں ہوں!"

"وہ بچہ ہے تو آپ بھی ضد کرنے لگے!"

سیٹھ صاحب تاجر تھے، سمجھ گئے، سودا ہونے کا یہی وقت ہے، کھڑے ہو گئے، گویا

گویا واپس جا رہے ہیں۔
"تو آپ کو میری پیش کش منظور نہیں ہے، آپ مس تبسم کے بچپن پر چھ ہزار روپے کا
نقصان کر رہی ہیں، مجھے تبسم پر نہیں آپ پر حیرت ہے"

بڑھیا نے پوچھا،
"اگریمنٹ کتنے دنوں کا کرو گے سیٹھ صاحب؟
"کمپنی نے کتنے دنوں کا کیا ہے؟"
"سال بھر کا۔"
"میں پانچ برس کا کروں گا!"
بڑھیا نے سوچا
اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے، وہ حسرت اور بے بسی کے ساتھ بولی
"تو کیا کروں؟"
کیجیے کیا، جائیے بلا لائیے جا کر، وہ دستخط کر دیں!"
"آپ بیٹھیے، میں جاتی ہوں، اسے لیکر ابھی آئی!"
زہرہ چلی گئی، سیٹھ صاحب نے دانتوں کے نیچے دبائے ہوئے سگار کا ایک کش لگایا
اور کچھ سوچنے لگے۔
سیٹھ صاحب بمبئی کے ایک کامیاب تاجر تھے، بیس برس سے وہ تھیٹریکل کمپنی کامیابی
سے چلا رہے تھے، اسی میں لکھ پتی بن گئے، وہ اپنی ایکٹرسوں کو نچاتے بھی تھے، اور ان کے
لیے دولتمند گاہک بھی فراہم کرتے تھے، موقع ہوتا تھا تو اپنا کمیشن بھی وصول کر لیتے تھے،
لیکن کمیشن ایکٹرس کی جیب سے نہیں، اس کے جسم سے وصول کرتے تھے۔

نیشنل تھیٹرز لمیٹڈ کے نام سے انھوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی بھی قائم کر رکھی تھی کمپنی کے مردانہ اداکاروں کے انتخاب کا کام انھوں نے ڈائرکٹر اور منیجر کے سپرد کر رکھا تھا، ایکٹرسوں کا انتخاب خود کرتے تھے، اپنی نگاہِ انتخاب پر انھیں ناز تھا، تھیٹر سے روپیہ بھی کماتے تھے اور تھیٹر میں کام کرنے والیوں سے تفریح بھی کرتے تھے ان کا گانا سنتے تھے، ان کا ناچ دیکھتے تھے، ان کے ساتھ پکنک پر جاتے تھے، کوئی بہت پسند آگئی تو "صرف خاص" میں شامل کر کے تصرف میں بھی لے آتے تھے یہ سارے کام وہ اس ہوشیاری سے کرتے تھے کہ کبھی کسی کو ان کی پاک دامانی پر شبہ نہیں ہوا، پہلی سفارش تو خود ان کی عمر تھی، لوگ جوانوں پر شک کرتے ہیں بوڑھوں پر نہیں کرتے، حالانکہ بوڑھے جوانوں سے کہیں زیادہ زندہ دل ہوتے ہیں۔ دوسری سفارش ان کی وضع احتیاط تھی، وہ گناہ بڑی احتیاط کے ساتھ سات پردوں میں چھپ کر کرتے تھے ان کی تھیٹریکل کمپنی کے لوگ تک اس فریب کے شکار تھے۔ وہ سمجھتے تھے داور سیٹھ سے بڑھ کر کوئی شریف آدمی نہیں ہو سکتا، وہ کبھی بدراہ ہو سکتے ہیں؟ اس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا وہ ہر ایکٹر کو بھائی اور ہر ایکٹرس کو بیٹی سمجھتے تھے، سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں کہتے ضرور تھے اس مقدس رشتہ کے قائم ہو جانے کے بعد کسی کو شبہ کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی تھی؟

ادھر سیٹھ صاحب کا سگار ختم ہوا، ادھر زہرہ تسنیم کپڑے بدل کر حاضر ہوئی، سیٹھ صاحب اپنی کامیابی پر بلکہ فتح مندی پر مسکرائے لیکن یہ نشہ جلد ہی ہرن ہو گیا تسنیم نے کھڑے کھڑے کہا

"لائیے کہاں ہے اگریمنٹ؟ دستخط کر دوں!"

سیٹھ صاحب نے کہا

بیٹھیے! ——— آپ کو تفصیلات کا علم تو ہو گیا ہو گا، اپنی والدہ سے؟"

تسنیم ویسے ہی کھڑے کھڑے بولی،

"جی! —— لائیے کاغذ دیجئے!"

سیٹھ صاحب نے جیب سے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا اور تسنیم کی طرف بڑھا دیا۔ تسنیم نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی، اور دستخط کر دیے۔ سیٹھ صاحب نے کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے کہا،

"شکریہ! —— کب سے آپ ہماری کمپنی میں ایکٹ کریں گی؟"

"جب سے کہیے! —— آپ اطلاع بھیج دیجیے گا میں آجاؤں گی!"

بالکل ٹھیک، ایسا ہی ہوگا —— اگر آپ کو فرصت ہو تو چلیے ایک نظر کمپنی پر ڈال لیجیے اور ڈرامہ بھی لیتے آئیے، اطمینان سے اپنا حصہ ریہرسل شروع ہونے سے پہلے پہلے یاد کر ڈالیے گا!"

تسنیم کسمسا کر بولی

"ابھی اسی وقت!"

سیٹھ صاحب نے اس کی کیفیت سے ذرا بھی اثر لیے بغیر کہا۔

"کیا ہرج ہے آئیے چلیں، میں آپ کو پہنچا جاؤں گا یہاں تک"

تسنیم کوئی عذر پیش کرنے والی تھی کہ زہرہ نے کہا

"ہو آؤ بیٹیا تھوڑی دیر کے لیے!"

تسنیم نے جھلا کر کہا،

"چلیے!"

زہرہ بولی،

"ایسے ہی چلیئے؛ کپڑے تو بدل لو"

تسنیم نے چڑ کر کہا،

"کوئی ایکٹ کرنے تھوڑی جا رہی ہوں، کپڑے بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سیٹھ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا

"ٹھیک کہتی ہے تسنیم، ہر وقت اداکاری نہیں کی جاتی ——— آیئے چلیئے!"

تسنیم سیٹھ صاحب کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر "نیشنل تھیٹرز لمیٹڈ" کی عالی شان عمارت کی طرف روانہ ہوئی، اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد انور آیا، اس نے زہرہ سے پوچھا،

"تسنیم کہاں ہیں؟"

"وہ تو کمپنی گییں!"

"آج؟ وہ تو کہہ رہی تھیں، آج کوئی پروگرام نہیں ہے! ——— اچھا میں جاتا ہوں، شام کو آؤں گا، وہ آئیں تو کہہ دیجیے گا، میں آیا تھا!"

"کہہ دوں گی ——— بیٹھو، شاید ابھی آتی ہو!"

"میں پھر آؤں گا، معلوم نہیں وہ کب آئیں!"

انور چلا گیا ٭

باب ۲۴

ایک رات

تسنیم کی شرکت سے بمبئی کا تھیئٹریکل مذاق بدل گیا۔ نیشنل تھیئٹرز کے تماشے پبلک سے خراجِ تحسین وصول کرنے لگے۔ جس روز مس تسنیم کا کام ہوتا تھا تو خلقت ٹوٹ پڑتی تھی۔ اس کی فلم "پری خانہ" بمبئی میں دکھائی جا رہی تھی اور بہت کامیابی سے چل رہی تھی، ۲۱ واں ہفتہ تھا اور تماشائیوں کی کثرت کا یہ حال تھا کہ بغیر لاٹھی چارج کے مجمع قابو میں نہیں آتا تھا۔ جو لوگ پری خانہ دیکھتے تھے یہ نیشنل تھیئٹرز کا تماشا ضرور دیکھتے تھے [illegible] تسنیم کے قیامت خیز حسن کا نظارہ کرنے والوں کے دل میں اشتیاق پیدا ہوتا تھا کہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ تصویر پھر تصویر ہے۔ جب تصویر ایسی ہے تو وہ خود کیسی ہوگی؟ "پری خانہ" کی کامیابی نے نیشنل تھیئٹرز کے تماشہ کو اور زیادہ کامیاب بنا دیا تھا۔ بمبئی آج کل شیریں فرہاد کا تماشا دکھا رہی تھی۔ شیریں کا پارٹ تسنیم اس خوبی سے کرتی تھی کہ جو دیکھتا تھا دل پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہزاروں آدمی روزانہ یوں لوٹ جاتے تھے۔ وہ جتنی پردہ فلم پر کامیاب تھی اس سے زیادہ اسٹیج پر کامیاب تھی۔

شیریں فرہاد کے باقاعدہ تماشائیوں میں قاسم سیٹھ بھی تھے۔ وہ اسٹیج کے بالکل سامنے کی نشست پر بیٹھتے تھے یہ نشست ان کے لیے ہمیشہ ریزرو رہتی تھی۔ وہ فلم کے

قائل نہیں تھے کبھی سینما ہاؤس کی طرف رخ بھی نہیں کرتے تھے، وہ تھیٹر کے قائل تھے اور یہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اسٹیج پر جتنی مکمل اور فطری اداکاری ممکن ہے۔ اسکرین پر اس کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا، اور تھیٹر کبھی نہیں دیکھتا تھا۔ وہ فلم کا رسیا تھا، اور تھیٹر کو زمانہ قدیم کی ایک یادگار رکھا کرتا تھا۔

دادر ہمیشہ قاسم سیٹھ کو ہاتھوں ہاتھ لیا کرتا تھا وہ جانتا تھا یہ بڈھا بمبئی کا ملک التجار ہے۔ میری کمپنی کے کسی مال کو اگر اس نے پسند کر لیا تو وارے نیارے ہیں، جس ایکٹرس پر نظر پڑ گئی، وہ بھی نہال، اور میری جیب بھی سونے چاندی کی ٹکیوں سے بھر جائے گی لیکن قاسم سیٹھ اپنے آپ کو لیے دیے رہتے تھے، وہ دادر کے دام میں کبھی نہیں پھنسے، وہ بوڑھے تھے اور جوانوں سے زیادہ عیاشی کرتے تھے لیکن ان کی دلچسپیوں کے مراکز اور تھے تھیٹر وہ بری نیت سے نہیں آتے تھے، صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے تشریف لاتے تھے، جب انہیں گھر بیٹھے ذرا سے اشارے پر ایک سے ایک نوجوان، طرحدار اور خوبصورت عورت، ہر مذہب و ملت کی مل سکتی تھی تو وہ ایکٹرسوں سے تعلقات قائم کر کے اپنی پوزیشن کیوں خراب کرتے؟ اپنے تئیں بدنام کیوں ہونے دیتے؟ دادر کبھی کبھی اصرار کر کے بعض ایکٹرسوں کو ان کے حضور میں باریاب بھی کر دیتا تھا لیکن سیٹھ صاحب نے نہ اس کی کبھی حوصلہ افزائی کی، نہ ایکٹرسوں کی۔

لیکن اب سیٹھ صاحب میں وہ ایک خوشگوار تبدیلی دیکھ رہا تھا جس روز تسنیم کا کام ہوتا تھا۔ وہ ضرور تشریف لاتے تھے، آخر وقت تک دیکھتے رہتے تھے اور اس حشر بپا کر دینے والی ایکٹرس کو ایسی نظروں سے دیکھتے تھے کہ بس نہیں چلتا ورنہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جاتے —— اس تبدیلی سے دادر بہت خوش تھا، اسے اب دال گلتی

نظر آرہی تھی۔ یہ تبدیلی اس کے روشن مستقبل کا پتہ دے رہی تھی۔

بات یہ تھی کہ ادھر مسلسل سٹے اور ریس میں داور ہار رہا تھا۔ وہ جب ہارتا تھا۔ اس امید پر کہ اب وہ سارا پچھلا نقصان برابر سرابر کرے گا لیکن اس کا ہر داؤں پٹ پڑتا تھا ریس اور سٹہ کے لیئے دولتِ قارون بھی کافی نہیں ہو سکتی، تھیٹر کی آمدنی کب تک ساتھ دیتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی، وہ دیوالیہ ہونے کے قریب ہو گیا، اب کیا ہو؟ یہی سوال اسے پریشان کیے ہوئے تھا، بار بار اس کی نگاہ انتخاب سیٹھ پر پڑتی تھی مگر ان کی سردمہری کا تصور اس کے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا دیتا تھا، لیکن اب وہ تسنیم کی طرف مائل ہو رہے تھے، پھر انھیں اسیرِ دام کرنا کیا مشکل ہے؟ یہ سوچ کر ایک روز مسکراتا ہوا ہٹرول میں آیا اور سیٹھ صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہمارے بڑے نصیب کہ سیٹھ صاحب کے قدم آتے تو ہیں یہاں!"

سیٹھ صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا،

"آج کل آپ کے یہاں اچھے کھیل ہو رہے ہیں اور یہ نئی ایکٹرس تسنیم تو اتنی فطری اداکاری کرتی ہے مجھے حیرت ہوتی ہے!"

داور کو یقین ہو گیا، اب پانسہ خالی نہیں جائے گا، اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"لیکن اب تو یہ کھیل ہمیں بند کرنا پڑے گا، شاید مس تسنیم کو بھی جواب دے دینا پڑے گا"

اب سیٹھ صاحب خاص طور پر متوجہ ہوئے۔ انھوں نے داور کی طرف دیکھ کر کہا،

"کیوں؟"

"نقصان ہو رہا ہے، اور اس نقصان کو پورا کرتے کرتے میں دیوالیہ ہو گیا ہوں"

"نقصان ہو رہا ہے؟ تعجب ہے!"

"تعجب کی اس میں کیا بات ہے، سیٹھ صاحب!"

"تماشائیوں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ہزاروں آدمی مایوس ہو کر ٹکٹ نہ لینے کے سبب لوٹ جاتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ نقصان ہو رہا ہے۔"

جی ہاں یہی تو تماشہ ہے! ہال چھوٹا ہے آدمی کم آتے ہیں، اگر اس کی توسیع ہو جائے، اور زیادہ آدمیوں کی گنجائش پیدا کر لی جائے تو فائدہ بھی ہو سکتا ہے، میں نے حماقت یہ کی کہ یہ نہیں دیکھا آمدنی کیا ہو گی، اندھا دھند خرچ کرتا چلا گیا، صرف شیریں کے لباس پر بیس ہزار خرچ ہو گیا، سین سینری پر پچاس ہزار کے لگ بھگ صرفہ آیا۔ اداکاروں کو منہ مانگی تنخواہیں دینی پڑیں۔ دوسرے اداکاروں کے لباس وغیرہ پر بھی ہزاروں روپیہ خرچ ہو گیا، خرچ اس امید پر کیا تھا کہ آمدنی ہو گی آمدنی ہوئی پھر بھی مار کھا گئے ہم!"

سیٹھ صاحب نے تشویش انگیز لہجہ میں کہا۔

"یہ تو بڑی افسوس ناک خبر سنائی آپ نے!"

"جی ہاں میرے لیے تو یہ خبر موت سے کم نہیں ہے!"

"پھر اب کیا ہو گا؟"

"بند کرنا پڑے گا یہ سارا کاروبار!"

"نہیں ایسا نہ کیجیے!"

"جی تو میرا بھی نہیں چاہتا لیکن کروں کیا مجبور ہوں؟"

"قرض لے لیجیے کہیں سے!"

"بہت کیا اب نہیں ملتا!"

"کتنا روپیہ چاہیے آپ کو؟"

داور کی باچھیں کھل گئیں، اس نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا،

"کم سے کم ڈیڑھ لاکھ!"

"ڈیڑھ لاکھ؟"

"جی!"

"بہت ہے!"

بہت تو کچھ نہیں ہے سیٹھ صاحب، انتظام ٹھیک ہو جائے گا تو یہ رقم چھ مہینے میں

یہ وصول ہو سکتی ہے!"

"آپ کو یقین ہے؟"

"کاغذ لکھا لیجئے!۔۔۔ ارے صاحب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیجئے!"

"نہیں میں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا، لیکن اگر میں نے دیکھا کہ میرا روپیہ ڈوب

نہیں جائے گا، تو قرض دینے پر غور کروں گا!"

آپ نے مجھے مرنے سے بچا لیا، سیٹھ صاحب کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا

کروں۔۔۔ کب حاضر ہوں ہم لوگ؟"

"ہم لوگ کیا؟ اپنے ساتھ اور کسے کسے آپ لائیں گے؟"

"مس تسنیم کا ہونا تو ضروری ہے!"

سیٹھ صاحب کا بوڑھا چہرہ جوان ہو گیا، خوش ہو کر بولے

"کیوں؟"

میں روپیہ لوں گا، وہ شکریہ ادا کریں گی، آپ کی اس آرٹ نوازی کا، ان کی زندگی بھی تو اسی سے ہے!"

"یہ کیوں وہ فلم کمپنی میں بھی تو کام کرتی ہیں؟"

"ارے ہاں کرتی ہیں لیکن وہاں کی آمدنی پوری نہیں پڑتی!"

"سیٹھ صاحب نے مسکرا کر کہا،

شاہانہ ٹھاٹھ ہوں گے ــــــــ اور رہنے بھی چاہئیں!"

داور صاحب موضوع گفتگو کی تبدیلی سے گھبرا گئے، انھوں نے سیٹھ صاحب کو گھیرا

"جی تو کب ہم لوگ حاضر ہوں؟"

"جب چاہیے، آپ کا گھر ہے! لیکن آج کل میں تبادلہ آب و ہوا کے خیال سے سمندر کے کنارے ورسوا کے بنگلہ میں رہتا ہوں، وہیں آئیے"

"وہیں آجائیں گے، تو کس وقت؟"

"میں فی الحال مستقل طور پر تو وہیں رہتا ہوں، جب چاہیے آئیے!"

کل سے تسنیم کو بھی فرصت ہے، کل ہی حاضر ہوتے ہیں ہم لوگ! ــــــ شام کا وقت ٹھیک رہے گا؟"

بہت ٹھیک، اس وقت مجھے بالکل فرصت ہوتی ہے ــــــ تو یوں کیوں نہ کیجیے کہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے!"

داور نے ہنستے ہوئے کہا

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے ــــــ!"

پردہ اٹھا، اور تسنیم اپنے حسن کی بجلیاں گراتی، اپنی آنکھوں سے شراب برساتی

بل کھاتی اور لچاتی، ناگن کی طرح لہراتی، اور ہرنی کی طرح کلیلیں کرتی، کوئل کی طرح کوکتی اور بلبل کی طرح چہکتی، اسٹیج پر نظر آئی۔ سیٹھ صاحب نے داور کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ہمہ تن ادھر ہی تسنیم کی کافر ادائیوں کا ماجرا دیکھنے لگے، وہ اس طرح تسنیم کو دیکھ رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا،

ہے نظارہ جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

انھی کے لیے کہا گیا ہے!

داور نے سیٹھ صاحب کی یہ بیخودی دیکھی، ایک موٹا سا نیم سوختہ سگار جیب سے نکالا، احتیاط سے اسے دانتوں کے نیچے دبایا، سلگایا اور مسکراتا ہوا ہال سے نکل کر کیبن میں پہنچ گیا، اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا کہ سیٹھ صاحب سے جو روپیہ ملے گا وہ کس طرح صرف کیا جائے گا؟؛

باب ۲۵

پہلی ملاقات

تسنیم بڑی خود دار عورت تھی، خود دار ہلکا لفظ ہے، خود پرست، متکبر اور
آشفتہ مزاج! وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، مردوں سے تو اسے چڑ تھی
کیا مجال ہے کسی کو منہ لگائے، اس کے پیشہ کا تعلق مردوں سے تھا، اس کی شان،
آن، غرور، ہر چیز صرف مردوں ہی کی قدر دانی، اور فدا کاری کا نتیجہ تھی لیکن وہ
مردوں پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتی تھی جیسے ایک سرمایہ دار کام مزدوروں سے
ہے لیکن نہ اُن کے دکھ درد کا شریک ہوتا ہے، نہ سیدھے منہ بات کرتا ہے، جیسے
ایک جاگیردار کہ اس کی عشرتِ شبینہ، اور راحتِ حیات، تمام تر رہینِ منت ہوتی
ہے کسان کی مشقت اور محنت کی لیکن نہ وہ اس کی مصیبتوں میں کام آتا ہے، نہ لطف
سے پیش آتا ہے، یہی حال تسنیم کا تھا، وہ اپنے سرمایۂ حسن پر نازاں تھی، اپنے جمال
کی جاگیر پر مغرور تھی، وہ اپنے کسانوں اور مزدوروں کو نگاہ حقارت سے دیکھتی
تھی، ان سے سیدھے منہ بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی،

جب تک اسے روپیہ کی ضرورت تھی، وہ ہر بات گوارا کر کے اپنا جسم بیچا کرتی رہی،
لیکن سرمایہ داروں سے وہ اکڑ کر ملتی تھی، نہ تبسم کی بجلیاں، نہ اداؤں کے جال، نہ نگاہ

کا پھندا، نہ فریب کی کمند، تم نے دام دیئے میں نے اپنا جسم پیش کر دیا، اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن قدر دان اس کی بے رخی، ترش کلامی اور چینِ پیشانی کو بھی اداؤں میں شمار کرتے تھے، اور لطف لیتے تھے، جب سے وہ فلم اور تھیٹر میں کام کرنے لگی تھی۔ ضرورت سے بہت زیادہ روپیہ اسے ملنے لگا تھا۔ اب اس کے دلّال نہیں دوڑتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ خود اس کے گھر کا طواف کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کو شرفِ باریابی عطا کر لی تھی، کچھ دھتکار دیے جاتے تھے، جو باریاب کیے جاتے تھے، وہ اپنی تجوری کی کنجی اس کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ اس سپردگی اور فداکاری کے باوجود اس کی جبیں پر شکن بدستور قائم رہتی تھی، نہ جانے کیوں، وہ ہر مرد سے نفرت کرتی تھی، انور کا عمل دخل سب سے زیادہ اس کے ہاں تھا۔ وہ بے دریغ روپیہ اس پر خرچ کرتا تھا لیکن کیا مجال تھی کہ وہ اسے چھو تو لے، فلم کمپنی کے ڈائرکٹر اور تھیٹریکل کمپنی کے مالک اس کے رزاق تھے لیکن ان سے بھی وہ اس تیہے سے ملتی تھی کہ بعض وقت وہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ دل کی بات کہیں یا نہ کہیں، کہیں خفا نہ ہو جائے! کہیں جھڑک نہ دے!

• داور بڑی دیر سے بیٹھا تھا اور اسے قاسم سیٹھ کے ہاں چلنے پر رضا مند کرنے کی اسکیم سوچ رہا تھا، لیکن جب وہ زبان کھولنا چاہتا تھا، تسنیم کا چہرہ دیکھ کر حوصلہ ہار جاتا تھا!

تسنیم نے پوچھا،

"آج کیسے تشریف لائے؟"

"آ گیا یونہی!"

"کوئی خاص بات ہے ؟"

"ہاں ہے تو!"

"کہیے کہہ ڈالیے!"

اس لطف آمیز گفتگو سے داور کی ہمت بندھی، اس نے کہا،

"بات یہ ہے کہ کمپنی کو برابر نقصان آ رہا ہے!"

"نقصان آ رہا ہے، یہ کیسے ؟"

"اب بغیر قرض کے کام نہیں چل سکتا ——— میں نے ایک آسامی ڈھونڈ لی ہے، لیکن تمہاری مدد چاہیے!"

"میری مدد؟ میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"قاسم سیٹھ روپیہ دینے کو تیار ہیں، دے دیں گے ڈیڑھ لاکھ قرض بشرطیکہ ———"

"آپ رک کیوں گئے؟"

گھبرا کر بولے،

"میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سفارش کر دو تو کام بن جائے گا!"

تسنیم تیوری چڑھا کر بولی،

"میں سفارش؟ لیکن کیوں؟ مجھے کیا پڑی ہے سفارش کرنے کی! نقصان ہو رہا ہے تو بند کر دیجیے کمپنی!"

داور کا منہ سوکھ گیا، ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا،

"ہاں پھر یہی کرنا پڑے گا!"

تسنیم نے پوچھا،

"یہ قاسم سیٹھ کون ہیں؟"

"وہی جو روز تمہارے سامنے بیٹھے تمہیں گھورا کرتے ہیں"

"وہ بوڑھا آدمی؟"

"ہاں ہاں وہی ـــــ کروڑپتی ہے کروڑپتی!"

تسنیم مسکرانے لگی، اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، سیٹھ صاحب کے کروڑپتی ہونے پر نہیں، ان کی بوڑھی عمر میں رنگین مزاج ہونے پر، اس کی سرشت کچھ عجیب تھی، وہ جوانوں کو دھتکارتی تھی، بوڑھوں کو پچکارتی تھی، وہ جوانوں کی پر لطف باتوں سے لطف اندوز نہیں ہوتی تھی، لیکن شوقین مزاج بوڑھوں کی بے تکی باتوں سے لطف لیتی تھی، اسے جوانوں کے مقابلہ میں بوڑھوں سے کھیلنے میں مزا آتا تھا، وہ جوانوں سے جلتی تھی، اور بوڑھوں کو بے وقوف بناتی تھی۔ وہ جوانوں سے کبھی مسکرا کر بھی بات نہیں کرتی تھی لیکن بوڑھوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ وہ قاسم سیٹھ کی نگاہوں کو عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ داور نے ان کا تعارف کرایا تو اسے ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آنے کی امید پیدا ہو گئی، اس نے ایک شگفتہ تبسم کے ساتھ کہا،

"لیکن قاسم سیٹھ میری سفارش مانیں گے کیوں؟"

"مان لیں گے، میں کہتا ہوں!"

"کیسے جانا آپ نے؟"

"باتیں ہو چکی ہیں!"

"ہمیں بھی سنائیے کیا باتیں ہوئیں آپ کی؟"

"بس مختصر یوں سمجھ لو، ہزار جان سے فدا ہے تم پر، اگر تم نے پھانس لیا اس بڈھے کو، تو کئی پشتوں تک مزے ہی مزے ہیں!"

"سچ؟"

"ایک ایک حرف سچ، کہو تو قسم کھائیں!"

"آپ قسم تو ہمیشہ جھوٹی کھاتے ہیں، ویسے تو کبھی کبھی سچ بھی بول لیتے ہیں!"

اس تعریف پر داور صاحب خفا نہیں ہوئے بلکہ کچھ خوش ہی ہوئے۔

تسنیم نے کہا

"اگر یہ بات ہے تو چلیئے!

خوشی سے بے قابو ہو کر بولے،

"چلو!"

"ابھی؟"

"ہاں اور کیا!"

"اچھا چلتی ہوں، لیکن ایک بات سن لیجیئے، کان کھول کر ———"

"وہ ہمیں معلوم ہے، اس رقم میں تمہارا کمیشن بھی رہے گا!"

"کتنا؟"

"۲۵ ہزار"

"اوں ہوں، کم ہے!"

"۳۰ ہزار سہی!"

"یہ بھی کم ہے، میں نہیں جاتی!"

داور نے سوچا کچھ اپنی گرہ سے تو دینا نہیں ہے بولا،

"۴۰ ہزار سہی !"

"بنیا بن چھوڑیے، ۵۰ ہزار پر سودا کرتے ہوں تو چلیے، ورنہ تشریف لے جائیے، میں نہیں جاؤں گی!"

"یہ بھی منظور ۵۰ ہزار سہی، چلو تو!"

"چلتی ہوں لیکن ایک بات اور سن لیجیے کان کھول کے!"

عاجز آکر بولے،

"کہو بھئی، اب کیا رہ گیا ہے کہنے کو؟"

"اگر میری بات خالی گئی تو میں تھیٹر کی نوکری چھوڑ دوں گی!"

"تمھاری بات خالی گئی تو تھیٹر ہی نہیں رہے گا، نوکری کس کی چھوڑو گی؟"

تسنیم ہنس پڑی، اس نے کہا،

"اچھا بیٹھیے میں ابھی آئی!"

وہ کپڑے بدلنے چلی گئی اور تھوڑی دیر سولہ سنگار کر کے واپس آئی، سادہ لباس میں بھی وہ کچھ کم حسین نہیں تھی، لیکن اس زرق برق لباس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا! داور نے تسنیم کو نظر بھر کر دیکھا اور دل ہی دل میں اپنی کامیابی کا یقین کر لیا۔

سمندر کے بالکل کنارے، ورسوا میں قاسم سیٹھ کا ایک فلک نما بنگلہ تھا، خاموش پرسکون، گویا جنت کا ایک ٹکڑا، صرف حور کی کسر تھی، اور وہ بھی اب آگئی تھی، یہاں کا منظر اتنا رومان انگیز، اور پرکیف تھا کہ تسنیم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی

اس نے چپکے سے داور سے کہا،

"بڑی اچھی جگہ ہے!"

"جنت کیوں نہیں کہتیں؟"

"واقعی جنت ہی کا مزا آتا ہو گا یہاں!"

قاسم سیٹھ استقبال کے لیے ڈرائنگ روم کے دروازے تک آ چکے تھے، انھوں نے بڑھ کر نئے مہمان کا خیر مقدم کیا، تسنیم سے کہا،

"زہے قسمت کہ آپ یہاں آئیں!"

تسنیم بجلی گراتی ہوئی بولی

"اب وہ شعر بھی پڑھ دیجیے، کیا ہے؟"

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

قاسم سیٹھ اس شوخی اور برجستگی پر پھڑک گئے، انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اسی قہقہے سے تسنیم نے اندازہ لگایا کہ بوڑھے ہیں مگر دم خم جوانوں کا سا ہے سیٹھ صاحب نے کہا،

آئیے چمنستان میں چلیں!"

بنگلہ کا عقبی حصہ سمندر کے بالکل سامنے پڑتا تھا، یہیں ایک چھوٹا سا لیکن نہایت خوشنما چمنستان سیٹھ صاحب نے اپنے ذوق کی تسلی کے لیے بنایا تھا، ایک کنج میں کرسیاں پڑی تھیں، وہیں یہ قافلہ بیٹھا، اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

سیٹھ صاحب کا یہ حال تھا کہ بچھے جاتے تھے، ان کا بس چلتا تو تسنیم کو اپنے دل میں بٹھا لیتے، وہ اس کیفیت کو سمجھ رہی تھی اور التفات و تبسم سے اُن کی آتش ہوس کو تیز سے تیز تر کر رہی تھی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا، بڈھا دلچسپ شکار ہے، اسے

ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے،

پھر مطلب کی باتیں شروع ہوئیں، تسنیم نے کہا،

"داور صاحب مقروض ہو گئے ہیں، انھیں روپیہ کی ضرورت ہے!"

سیٹھ صاحب بولے

"آپ کا حکم ہیں کب ٹال سکتا ہوں جتنا کہیئے دے دوں!"

تسنیم بولی،

"ایک لاکھ دید یجیئے! داور صاحب آدمی ایماندار ہیں ادا کر دیں گے!"

داور نے کہا،

"ایک لاکھ نہیں ڈیڑھ لاکھ مس تسنیم!"

سیٹھ صاحب نے تائید کی،

"جی ہاں، کل تو یہ مجھ سے ڈیڑھ ہی لاکھ کو کہہ رہے تھے!"

تسنیم نے بڑی سنجیدگی سے کہا

"ٹھیک ہے، آپ سے اور مجھ سے، دونوں سے انھوں نے ڈیڑھ ہی لاکھ کہا ہے لیکن لیں گے ایک ہی لاکھ!"

داور بولے، "واہ اس سے کام کیسے چلے گا؟"

تسنیم نے کہا،

آپ پچاس ہزار کمیشن کا مجھے بھی تو دیں گے، وہ ہیں نہیں لینی جتنی رقم حقیقتاً آپ کو لینا ہے، سیٹھ صاحب سے وہ لے لیجیئے اور قصہ ختم کیجیئے!"

سیٹھ صاحب نے غور سے داور کو دیکھا، داور کے منہ پہ ہوائیاں اڑنے لگیں سیٹھ صاحب

نے سوچا یہ ۰ ۵ ہزار کمیشن دینے پڑ رہا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مال مفت سمجھ کر رقم ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ داور سوچ رہا تھا عجیب عورت ہے، کمیشن کا یہاں ذکر کرنے کی کون سی ضرورت تھی، کیا سمجھ رہے ہوں گے سیٹھ صاحب۔ سیٹھ صاحب تسنیم کی وفاداری پر خوش تھے، کہ میرے لیے اپنے پچاس ہزار پر لات مار رہی ہے، داور یہ سوچ رہا تھا کہ بے بات کی بات کہہ کر اس حرامزادی نے بھانجی مار دی۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد سیٹھ صاحب نے کہا۔

"بہتر ہے، میں سوچ کر اپنے فیصلہ سے داور صاحب آپ کو مطلع کر دوں گا۔"

داور کا منہ لٹک گیا، اس نے کہا،

"بہت بہتر!"

لیکن وہ جان رہا تھا یہ رقم اب ملنے والی نہیں،

اتنے میں ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، سب لوگ اٹھ کر کھانے کے کمرہ کی طرف چلے، داور نے کہا،

"میں تو معذرت چاہتا ہوں سیٹھ صاحب!"

"کیوں؟ خیریت؟"

"کل سے میری طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے رات کے کھانے کو چند روز کے لیے بالکل منع کر دیا ہے۔"

"چلیے بیٹھیے تو، کھانا نہ کھایئے!"

"اب مجھے اجازت دیجیے، مجھے اسی وقت شہر پہنچنا چاہیے، ورنہ پروگرام گڑ بڑ ہو جائے گا۔"

قبل اس کے کہ سیٹھ صاحب کچھ کہیں، تسنیم نے کہا

"جانے دیجیے، جب انھیں کام ہے، اور طبیعت خراب ہے تو روکنے سے کیا فائدہ؟"

سیٹھ صاحب خاموش ہو گئے، داور دل ہی دل میں تسنیم کو گالیاں دیتا ہوا چلا گیا، دونوں کھانے کے کمرہ میں پہنچے، دیوار پر کچھ تصویریں آویزاں تھیں تسنیم ٹہل ٹہل کر ایک ایک تصویر دیکھنے لگی۔ دفعتہً اس کی نظر انور کی تصویر پر پڑی وہ ہکا بکا رہ گئی، اس نے پوچھا،

"یہ کون ہے؟"

سیٹھ صاحب نے کہا،

"یہ میرا لڑکا ہے انور!"

تسنیم خاموش ہو گئی، دونوں آکر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے، سیٹھ صاحب آہستہ آہستہ کھانا کھا رہے تھے لیکن ان کا دماغ تیزی سے تسنیم کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا، لقمہ تسنیم کے ہاتھ میں بھی تھا لیکن وہ بھی کسی گہری فکر میں مستغرق تھی،

کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بڑی دیر تک دونوں کی نشست رہی، اور مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی، اب تسنیم کی فکر دور ہو چکی تھی، اور وہ ہنس ہنس کر مسکرا مسکرا کر سیٹھ صاحب پر اپنی کمند پھینک رہی تھی، شاید زندگی میں پہلی مرتبہ، اس سے قبل بارہا اس نے مردوں کی، جوانوں اور بوڑھوں کی پذیرائی کی تھی، اپنے تئیں قیمت لے کر ان کے حوالے کر دیا لیکن قاسم سیٹھ سے آج وہ جس لگاوٹ کا اظہار کر رہی تھی، یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا، جن مردوں سے وہ کھیلتی تھی، ان سے بھی وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتی تھی بلکہ اپنے تئیں لیے دیے رہتی تھی، لیکن آج وہ سیٹھ صاحب کو اپنے درجہ اور حیثیت سے

گڑگڑا رہی تھی، ڈر ان کا کیا تھا، وہ تو ریجھنے پر ہزار جان سے تیار تھے ؎

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

چلتے وقت پھر ملنے، ملتے رہنے، آنے اور آتے رہنے کا سیٹھ صاحب نے وعدہ لیا، وہ وعدہ کر کے چلی گئی، اور وہ کھڑے ہوئے بڑی دیر تک، اس کا نقش پا دیکھتے رہے۔

سیٹھ صاحب اپنی طویل زندگی میں کسی ہستی سے اتنے متاثر نہیں ہوئے تھے جتنے تسنیم سے، اس عورت کو دیکھتے ہی ان کا جی چاہتا تھا سجدہ میں سر جھکا دیں، اُس وقت تک نہ اُٹھائیں، جب تک اس کا مرمریں ہاتھ، ان کے بار دوش سر کو خود نہ اُٹھائے، کیا یہ حسرت کبھی پوری ہو سکے گی؟ وہ کھڑے کھڑے یہی سوچ رہے تھے۔

باب ۲٦

وعدے وعید!

تسنیم گھر پہنچی، تو انور اس کے انتظار میں چشم براہ تھا، اس نے کہا

"بڑی دیر کردی؟ کہاں رہیں اتنی دیر تک؟"

"دعوت تھی ایک جگہ، کوئی بڑے سیٹھ ہیں، یہاں گے، ان کے ہاں!"

"اور کون کون تھا!"

"کوئی بھی نہیں!"

"صرف تم؟"

"ہاں، میں اور وہ!"

انور کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، اس نے کہا

"تم اپنی روش نہیں بدلوگی؟"

تسنیم نے برہمی کے ساتھ جواب دیا،

"کیوں بدلوں؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں مجھ سے؟"

تسنیم کی برہمی دیکھ کر انور ٹھنڈا ہو گیا،

"تم تو خفا ہو گئیں"

"آپ خفا ہونے کی بات کیوں کرتے ہیں؟"

اچھا یہ بتاؤ، تم میری تجویز منظور کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"شادی والی؟"

"ہاں!"

"ابھی نہیں!"

"پھر کب؟"

"جب وقت آئے گا!"

"اور وقت کب آئے گا؟"

"اپنے وقت پر!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، انور نے سنجیدگی اور جذبہ کے عالم میں کہا،

"میری زندگی سنسان ہے، ویران ہے، تم اسے آباد کر سکتی ہو، صرف تم!"

وہ مسکرائی

"شکریہ اس عزت افزائی کا!"

"ہنسی میں نہ ٹالو تسنیم، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

"کب سے؟"

"جب سے تمہیں دیکھا ہے، جب سے تم سے ملا ہوں، جب سے تمہارے قریب آیا ہوں!"

"یہ وعدے نہ جانے کس کس سے کر چکے ہوں گے، یہ باتیں آپ نے کیا جانے کن کن سے کی ہوں گی، ایسے آدمیوں کا بھروسہ کیا؟"

انور نے پہلو بدل کر کہا،

"تم مجھے غلط نہ سمجھو، زندگی میں، پہلی بار تم پر عاشق ہوا ہوں، اور جب سے عاشق ہوا ہوں!"

"ہر مرد محبت کا پھندا اسی طرح ڈالتا ہے، یونہی دھوکے دیتا ہے، یونہی جھوٹ بولتا ہے!"

"تم میرا امتحان لے سکتی ہو!"

"اگر آپ فیل ہو گئے تو؟"

"تو میرا منہ نہ دیکھنا!"

تسنیم کچھ سوچتی رہی، پھر اس نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا،

"تو پھر جائیے تشریف لے جائیے!"

"چلا جاؤں؟"

"ہاں! —— اب کبھی اپنا منہ نہ دکھائیے گا!"

"یہ کیوں؟"

"میرے امتحان میں آپ ناکام ہو چکے ہیں!"

یہ کہتے کہتے تسنیم مسکرا دی، انور نے کہا،

"تم ہر وقت مذاق کیوں کرتی رہتی ہو!"

"یہ لیجئے، مذاق کیا کیا میں نے؟"

"کون سا امتحان لیا تم نے میرا؟ —— بتاؤ کیا کہتی ہو؟"

"بتا تو دیا!"

"تم نے کچھ نہیں بتایا، تم کچھ نہیں بتاتیں، رحم کرو مجھ پر!"

تسلیم نے سنجیدگی کے ساتھ کہا،

"شادی بچوں کا کھیل نہیں ہے، یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے، مجھے سوچنے دیجیے!"

"آخر کب تک سوچو گی؟ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا؟"

"خدا نہ کرے، بوڑھے ہوں آپ کے دشمن ——— بدفال منہ سے کیوں نکالتے ہیں آپ! ——— مجھے سوچ لینے دیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں، شادی کروں گی تو آپ سے!"

"لیکن یہ وعدہ بدل تو نہ جائے گا؟"

"بدل تو سکتا ہے، اور اگر بدلا تو میں آپ کو پہلے سے بتا بھی دوں گی ——— لیکن فی الحال تو کوئی وجہ بدلنے کی نظر نہیں آتی!"

"تم دل پر چرکے بھی لگاتی ہو، اور پھاہا بھی رکھتی ہو، عجیب چیز ہو، خدا کی قسم تم بھی!"

تسنیم نے جواب دیا،

"عورت کا وجود اپنے لیے ایک زخم ہے، ناسور ہے لیکن دوسروں کے لیے یعنی مردوں کے لیے، وہ صرف پھاہا ہے، اور کچھ نہیں، وہ ان کے ظلم سہتی ہے لیکن اُف نہیں کرتی، وہ ان کی بے وفائیاں سہتی ہے مگر خود وفادار رہتی ہے، وہ ان کی خود غرضی دیکھتی ہے، مگر بے لوث رہتی ہے اور ان کی مکاریاں اور عیاشیاں دیکھتی ہے مگر دعائے خیر مانگنے کے سوا کچھ نہیں کرتی، وہ خنجر بن ہی نہیں سکتی، نشتر کی نوک بھی نہیں بن سکتی!"

انور نے کہا،

"لیکن ہر کلیہ میں ایک استثنا بھی تو ہوتا ہے، کیا تم بھی ویسی ہی عورت ہو جس کا قصیدہ پڑھ رہی تھیں ابھی!"

تسنیم نے وقار کے ساتھ کہا،

"نہیں ——— آپ نے سچ کہا، ہر کلیہ میں ایک استثنا ہوتا ہے، میں وہی عورت ہوں جو اس کلیہ سے آزاد ہے۔ میں بے وفائی کا جواب وفاداری سے نہیں دے سکتی میں خود غرضی اور فریب کے جواب میں سر نہیں جھکا سکتی، میں نہ بزدلی کا جواب دینے کی عادی ہوں، جو مجھ سے دغا کرے گا، میں اس کو دغا دیئے بغیر نہیں رہوں گی!"

"خواہ وہ میں کیوں نہ ہوں؟"

"کوئی ہو، آپ کا یا کسی کا ذکر کیا ——— لیکن یہ سوال آپ کے دل میں آیا کیوں؟ ارادہ کیا ہے، ابھی سے کہہ دیجیئے"

انور نے کہا،

"ارادہ یہ ہے کہ"

اک بنگلہ بنے نیارا

محبت کا بنگلہ، محبت کی دنیا، محبت کی جنت، جس میں صرف ہم تم ہوں اور کوئی نہ ہو۔"

"الفاظ تو آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں!"

اتنے میں زرینہ آگئی، جب سے وہ پرائمری تعلیم ختم کر کے سکنڈری درجہ میں

پہنچی تھی تسنیم نے اُسے بورڈنگ سے واپس بلا لیا تھا، اب وہ ہنسی گھر پر تھی اور روز موٹر پر بیٹھ کر اسکول پڑھنے چلی جایا کرتی تھی، وجہ یہ ہوئی کہ بورڈنگ میں لڑکیاں اسے چھیڑا کرتی تھیں، کوئی کہتی یہ تو نادر زادا ایکٹرس ہے، کوئی فقرہ سر کرتی، اسی لیے تو ابھی سے گانے اور ناچنے میں طاق ہے کسی کی طرف سے مطالبہ ہوتا، گانا سناؤ کسی کی فرمائش ہوتی، ناچ دکھاؤ، وہ عذر کرتی تو جواب ملتا، اب کی گھر جانا تو اپنی ممی سے سیکھ کر آنا، نزرینہ نے شکایت کی تسنیم نے مناسب یہی سمجھا کہ اسے بورڈنگ سے واپس بلا لیا جائے۔

محبت بھری نظروں سے نزرینہ کو دیکھ کر انور نے کہا،

"کہاں جا رہی ہیں ہماری نزرینہ؟"

وہ اٹھلا کر بولی،

"ہم نہیں بتاتے ——— جہاں ہمارا جی چاہ رہا ہے!"

انور نے پیار سے اسے کھینچ کر پاس بٹھاتے ہوئے کہا،

"نہیں بتاتیں اور بتا بھی دیا ——— چلو سینما دکھا لائیں تمھیں!"

یہ دل کی بات سن کر وہ پھڑک گئی، اس نے کہا،

"چلیے!"

تسنیم نے ٹوکا،

"اب؟ دس بجے رات کو؟ ——— جاؤ سو جاؤ چلو!"

"نزرینہ ماں کی سخت گھرکی پر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بےبسی کے ساتھ انور کی طرف دیکھنے لگی، اس نے کہا،

ہرج کیا ہے، کل اتوار ہے اسکول بھی نہیں جانا ہے، دیکھ آنے دو، بلکہ تم بھی چلو!"

"میں اپنی نیند نہیں خراب کرتی ــــــ جانا ہے تو کل دن میں چلیئے!"
انور نے زرینہ کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور کہا،
"کل چلیں گے ممی کے ساتھ!"
زرینہ راضی ہو گئی۔ تسنیم نے کہا،
"جاؤ بیٹی سو رہو، جلدی سے سو جایا کرو!"
زرینہ چلی گئی، اس کے جانے کے بعد انور نے تسنیم سے کہا،
"تم نے زرینہ کے بارے میں سوچا کیا ہے؟"
"کاہے کے بارے میں؟"
"میرا مطلب ہے اس کا مستقبل کیسا بنانا چاہتی ہو؟"
"اپنا سا!"
"یعنی اسے بھی ایکٹرس بناؤ گی اپنی طرح؟"
"ضرور بناؤں گی! ناچ گانے کی تعلیم تو گھر پر شروع بھی ہو گئی ہے"
"یہ ظلم کر رہی ہو لڑکی پر، یہ راستہ اس کے لیے موزوں نہیں ہے، وہ اس
قابل ہے کہ کسی شریف گھرانے کی بڑی ہو کر زینت بنے!"
تسنیم نے طنز کرتے کرتے ہوئے کہا،
شریف گھر تو بہت ہیں، لیکن شریف لوگوں سے خالی ہیں! ــــــ اور نہ بھی
خالی ہوں تو ہمیں کیا، جیسے ہم، ویسی ہماری لڑکی!"
"میرا کہنا مانو، یہ خیال دل سے نکال دو!"
"لونڈی بنا کر کسی شریف گھرانے میں اسے میں نہیں بھیجنا چاہتی!"

"وہ رانی بن کر رہے گی!"

تسنیم نے مسکرا کر پوچھا،

"اسی طرح جیسے میں آپ کے گھر رانی بن کر رہوں گی؟ کیوں ہے نا ٹھیک؟"

"ہاں بالکل ٹھیک!"

"بالکل غلط ——— وہ ناچے گی، گائے گی، کمائے گی!"

انور نے حیرت اور قدرے برہمی کے ساتھ پوچھا،

"کمائے گی؟ پیشہ کرے گی؟"

"نہ کرے گی تو کھائے گی کیا؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو! میں اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھنے کو تیار ہوں"

"وہ جائیداد جو ابھی آپ کو ملی بھی نہیں، حلوائی کی دوکان پر دادا جی کا فاتحہ"

آج نہ ملی تو کل ملے گی، آخر والد کا کبھی نہ کبھی انتقال ہوگا، والد کے علاوہ والدہ

کی بھی تو جائداد ہے، وہ تو میری ہے، وہ میں دے دوں گا زرینہ کو!"

"آپ کے والد گھر میں مجھے، اور زرینہ کو قدم رکھنے دیں گے؟"

"انھیں خبر ہی کیوں کی جائے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا، آپ اگر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اور زرینہ کو اولاد بنا کر

رکھنا چاہتے ہیں، تو پہلے اُن سے تحریری اجازت حاصل کیجئے پھر یہ سوال چھیڑیئے!"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"تاکہ میں جان لوں میرا حال کیا ہوگا، میری بچی کا مستقبل کیا ہوگا؟"

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں، ہو سکتا ہے، آسانی سے ہو سکتا ہے!"

"دیکھوں گی!"

"دیکھ لینا!"

تسنیم نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ انور نے کہا،

"راستہ کا سب سے بڑا پتھر بھی ہٹ چکا، اب والد مجھے شادی کی اجازت شوق سے دے دیں گے!"

"پتھر کیسا؟"

"سلمیٰ کا چند ماہ ہوئے انتقال ہو گیا، وہ میری بیوی تھی لیکن نہایت مغرور اور نامرغوب!

تسنیم پر یہ خبر سن کر، غم والم کی کیفیت طاری ہو گئی، اس نے کہا،

"اسی طرح کسی دن میرے مرنے کی خبر آپ کسی مرغوب عورت کو سنا کر بیاہ کی بات چیت کریں گے!"

لاحول ولا قوۃ، تم بھی کیسی بے تکی باتیں کرتی ہو ارے بھئی سلمیٰ سے میری شادی ماں باپ کے دباؤ سے بغیر مری مرضی کے ہوئی تھی، تم سے میں اپنی مرضی سے بیاہ کر رہا ہوں، یہ فرق کوئی معمولی فرق ہے؟"

تسنیم کی بےکیفی ان باتوں سے کم نہیں ہوئی، اس نے بے رخی کے ساتھ کہا،

"کچھ بھی ہو، وہ آپ کی بیوی تھی، اس نے آپ کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے، مرنے کے بعد تو آپ اس طرح کا ذکر نہ کرتے"!

"میں تو اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتا تھا، اس سے ایک دن بھی میری بنی!"

"کیوں؟"

"مزاج کا اختلاف تھا، ذوق کا اختلاف، طبیعت کا اختلاف! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس سے محبت کی جائے!"

"آوارہ تھی، میری طرح؟"

"یہ لو اپنا ذکر لے کے بیٹھ گئیں، تمھاری تو جوتی کی خاک کے برابر بھی وہ نہیں تھی، عجیب کینڈے کی عورت تھی، لڑاکا، اکڑو، مغرور، شوہر کو کبھی خوش نہ رکھنے والی عورت!"

"مجھ سے آپ کو اتنا حسن ظن کیوں ہے؟ میں خوش رکھ سکوں گی آپ کو؟"

"ضرور رکھ سکو گی!"

"اور اگر نہ رکھ سکی؟"

"تو بھی میں خوش رہوں گا، محبت جو کرتا ہوں تم سے!" ٭

باب ۲۷

فیصلہ کن گفتگو

قاسم سیٹھ انور کی نالائقی کے باوجود اسے چاہتے بھی بہت تھے، وہ اس کی حرکتوں سے نالاں و بیزار تھے لیکن اس کے پھانس بھی چبھ جاتی تھی تو اختلاج میں مبتلا ہو جاتے تھے، انور کی نالائقی اور بدمعاشی کی اصل وجہ یہی تھی کہ سیٹھ صاحب وفور محبت میں اس کی تربیت نہ کر سکے، انھوں نے بڑے چاؤ پیار سے سلمٰی کو بہو بنایا تھا لیکن وہ سلمٰی کو چھوڑ کر آوارگی کرنے لگا، اور وہ اسے کسی طرح بھی راہ راست پر نہ لا سکے، بالکل بے بس تھے اس کے سامنے، لیکن جب سے سلمٰی کا انتقال ہوا تھا، وہ اس سے بہت خفا رہنے لگے تھے۔

درہوا کے بنگلہ میں وہ صبح کا ناشتہ کر کے اطمینان سے آرام کرسی پر نیم دراز ٹائم آف انڈیا میں، شیئر بازار کے اتار چڑھاؤ کا حال پڑھ رہے تھے کہ دبے پاؤں انور آیا اور بیٹھ گیا، انھوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا،

"شہر سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں ۱۵ میل کے فاصلہ پر، یہاں بھی تم چین سے نہیں بیٹھنے دیتے"

انور نہ جانے کیا کیا مسائل طے کرنے آیا تھا، آشفتہ مزاجی کا یہ رنگ دیکھ کر

گھبرا گیا، اُس نے کہا،

"میں آپ کو بالکل تکلیف نہیں دیتا! آپ کے آرام اور سکون میں ذرا بھی خلل نہیں ڈالنا چاہتا!"

"پھر آپ کیوں تشریف لائے ہیں؟ فرمائیے!"

"میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ ——"

"روپیہ کی ضرورت ہے؟ میں اب تمھیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا، اپنی ماں کی جائیداد پر تم قابض ہو، اس سے گلچھرّے اڑاؤ!"

"روپیہ کے لیے نہیں، دوسرے کام سے آیا ہوں!"

"میں تمھارا کوئی کام نہیں کر سکتا، تم نے مجھے کسی کام کا نہ رکھا، جب سے سنا ہے کہ سلمیٰ دق میں مبتلا ہو کر مر گئی، منہ چھپائے چھپائے پھر رہا ہوں جیسے میں نے مار ڈالا ہو اُسے!"

"اس کی موت دق سے نہیں ٹائیفائڈ سے ہوئی، دق کا ذکر آپ نے کس سے سنا؟"

"ٹائیفائڈ بھی تمھاری ہی وجہ سے ہوا، وہ زندگی سے عاجز آ گئی تھی —— اب تک یونہی لنڈورے گھوم رہے ہو، کوئی اولاد ہوتی، تو بھی آنسو پُنچھتے، تم نالائق تھے، میں اسی سے آس لگائے تھا!"

انور نے کہا،

"ابّا جان میں نے فیصلہ کر لیا ہے، کہ اب اپنی زندگی یکسر بدل دوں گا، میں خود اپنی قابلِ نفرت زندگی سے تنگ آ چکا ہوں!"

سیٹھ صاحب متاثر ہوئے، انھوں نے کہا،

کاش ایسا ہوتا، کاش تم اپنی زندگی سنوار سکتے!"

انور نے جوش اور جذبہ کے ساتھ کہا،

"میں عہد کرتا ہوں کہ آپ کو اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی!— میں نے آپ کے اجڑے ہوئے گھر کو آباد کرنے کا تہیہ کر لیا ہے!"

سیٹھ صاحب بالکل خوش ہو گئے

"یعنی، تم شادی کرو گے، شرافت کی زندگی بسر کرو گے؟"

"جی!"

"کیسی اچھی، نیک، خوب صورت لڑکیاں میرے پیش نظر ہیں رقیہ، زبیدہ، ساجدہ جہاں کہو پیام بھیج دوں؟"

انور نے کچھ تامل کے بعد کہا،

"اس کا بندوبست بھی میں نے کر لیا ہے!"

"کیا مطلب؟ کہیں شادی ٹھہرالی ہے؟"

اس نے سر جھکا کر ادب کے ساتھ کہا،

"جی!"

سیٹھ صاحب سمجھ گئے، انور نے پڑوس کے سیٹھ قربان علی کی لڑکی عذرا سے پیام دیا ہو گا، کیونکہ انھیں خبر تھی، اکثر وہ انور کی دعوت کیا کرتی تھی، اور اس کے ساتھ سینما جایا کرتی تھی، وہ سیٹھ قربان علی سے بھی نفرت کرتے تھے اور عذرا سے بھی، اس کے نیم عریاں لباس، مردوں سے اس کے آزادانہ اختلاط اور کلبوں میں اس کی غیر معمولی مصروفیت سے، وہ بہت خفا تھے، انھوں نے فیصلہ کن انداز میں جل کر کہا،

"ہرگز نہیں، عذرا میری بہو بن کر ہرگز نہیں آسکتی!"

"انور نے کہا،

"میں کب اس کے لیے کہہ رہا ہوں، میں خود اس سے نفرت کرتا ہوں سیٹھ قربان علی نے بارہا کھانے پر بلایا، ایک مدت سے میں ان کی دعوتیں رد کر رہا ہوں، اُن کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھتا ہیں تو!"

"سیٹھ صاحب پھر خوش ہوگئے، انھوں نے کہا،

شاباش! بہت اچھا کیا تم نے، یہ لوگ بڑے خراب ہیں اور اس گھر کی عورتیں تو بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں!"

"جی میں جانتا ہوں!"

تو پھر کہاں ارادہ ہے؟"

انور خاموش رہا، سیٹھ صاحب نے پوچھا

"کس کی لڑکی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا!"

"ہائیں یہ کیا کہا، اپنی ہونے والی بیوی کے باپ کا نام تم نہیں جانتے؟"

"جی نہیں!"

"کون سا گھرانا ہے؟"

"وہ لوگ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں"

"پھر کہاں کے ہیں؟"

غالباً لکھنؤ کے!"

کوئی ہرج نہیں، اچھی جگہ ہے لکھنؤ بھی ——— لیکن کچھ اتہ پتہ معلوم ہو تو

س سلسلہ جنبانی کروں؟

"میں نے طے کر لیا ہے سب کچھ!"

"بالا ہی بالا، یہ کیا لغویت ہے؟ ——— وہ لڑکی کہاں رہتی ہے، کیا کرتی ہے؟"

انور نے کچھ تامل کے بعد کہا

"جی اس سلسلہ میں بھی میں نے ایک اصلاحی قدم اٹھایا ہے!"

"اصلاحی قدم؟ کیا مطلب؟"

میں ایک ایسے طبقہ کی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں، جو خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے، خوب سیرت ہے، لیکن سماج نے جسے ایکٹرس بننے پر مجبور کر دیا ہے، جو میری طرح اپنی زندگی سے تنگ آ گئی ہے اور شرافت و عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے ———"

"خاموش ———"

سیٹھ صاحب گرجے،

"کیا بک رہے ہو تم ——— میرے گھر میں ایک ایکٹرس کو بیاہ کر لاؤ گے؟ ایک آوارہ عورت کو ایک کمانے والی فاحشہ کو، اس بلی کو جو ستر چوہے کھا کر حج کرنے جا رہی ہے؟ ——— یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

لیکن ابا جان! ———"

"میں کہتا ہوں چپ رہو، خاموش رہو جاؤ تم، میں ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے سننا نہیں چاہتا، قاسم علی، کسی ایکٹرس کو اپنی بہو نہیں بنا سکتا، وہ لڑکے

سے ہاتھ دھو سکتا ہے، مگر ایسی غلطی نہیں کر سکتا کہ اس کی مونچھ نیچی ہو، اس کا خاندان بدنام ہو، خبردار اب جو یہ بات منہ سے نکالی، نالائق کہیں کے!"

"لیکن میں وعدہ کر چکا ہوں!"

"رد کرو اپنا وعدہ"

"میں زبان دے چکا ہوں!"

"کاٹ کر پھینک دو اپنی زبان!"

"میں اس سے محبت کرتا ہوں!"

"خنجر مار لو اپنے دل میں!"

"میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

سیٹھ صاحب بڑی تیزی سے اپنے کمرے میں گئے، فوراً واپس آئے، ان کے ہاتھ میں پستول تھا، انھوں نے انور کے سامنے چھوٹی سی تپائی پر پستول رکھ دیا اور کہا،

"تم اس ایکٹرس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے؟ یہ پستول موجود ہے، خودکشی کر لو!"

انور نے پستول پر ایک نظر ڈالی لیکن اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، وہ جانے کے لیے اٹھا سیٹھ صاحب نے اسے دھکا دے کر پھر کرسی پر بٹھا دیا، وہ بیٹھ گیا، انھوں نے کہا،

"تم یوں نہیں جا سکتے، میرا فیصلہ سن کر جاؤ!"

انور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا، انھوں نے کہا

اگر تم نے ایکٹرس سے شادی کی تو اس گھر کے دروازے تم پر بند کر دیئے جائیں گے

ہمیشہ کے لیے آبائی جائداد سے محروم کر دیئے جاؤ گے، ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کی صورت نہیں دیکھ سکو گے تم زندگی بھر —— اگر اس ایثار پر تیار ہو تو جس سے چاہو شادی کر لو، ورنہ عہد کرو کہ اب اس کا نام نہیں لو گے!"

انور نے اپنے چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری کر کے کہا،

"میں اس گھر کو چھوڑ سکتا ہوں آبائی جائیداد کو چھوڑ سکتا ہوں ——"

سیٹھ صاحب کے کان منتظر تھے کہ اب وہ کہے گا لیکن اپنی محبوبہ کو نہیں چھوڑ سکتا اس کے بجائے انھوں نے سُنا،

"لیکن میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا، یہ ایثار مجھ سے نہیں ہو سکتا!"

"سیٹھ صاحب نے اس کی طرف محبت بھری نظر سے دیکھا اور کہا،

"سچ کہتے ہو؟"

"سچ کہتا ہوں!"

"پھر تو نہ جاؤ گے اپنے قول سے؟"

"نہیں"

"ایکٹرس سے شادی کا خیال اب تو دل میں نہیں لاؤ گے؟"

"خیال نہ آئے، اس کا تو وعدہ نہیں کر سکتا، لیکن اپنا ذکر کر کے آپ نے مجھے باندھ لیا ہے!"

سیٹھ صاحب نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا،

"شاباش، مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی! —— میرے لڑکے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسے تم ہو!"

یہ کہتے کہتے سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر انھوں نے کہا،

"اب تم جا سکتے ہو!"

اندر چلا گیا، وہ جیسے ہی گیا ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، سیٹھ صاحب نے رسیور

اٹھایا، اور بولے، "ہیلو!"

"اوہ مس تسنیم؟"

"جی ہاں میں قاسم سیٹھ بول رہا ہوں"

"ضرور تشریف لائیے شام کو، آپ مجھے اپنے انتظار میں چشم براہ پائیں گی!"

رسیور رکھ کر پھر ٹائمز آف انڈیا کے شیئر بازار میں کھو گئے!

تھوڑی دیر کے بعد اٹھے، ٹہلتے ہوئے اپنے سونے کے کمرہ میں گئے، تکیہ کے غلاف سے ایک تصویر نکالی، بڑی احتیاط سے بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنے لگے، تصویر تسنیم کی تھی، تصویر کیا تھی نمونۂ قیامت، وہ اس کی سج دھج، وہ اس کا ڈیل ڈول وہ اس کا بانکپن،

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی!

سیٹھ صاحب محو تھے، دنیا وما فیہا سے بے خبر ــــــ،

باب ۲۸

باتوں باتوں میں

شام کو کوئی سات بجے کے قریب تسنیم قاسم سیٹھ کے شاندار بنگلہ میں داخل ہوئی لیکن وہ نہیں تھے، بوڑھی خادمہ سے اُس نے پوچھا،

"سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟"

" ابھی ٹیلیفون آیا تھا کہیں سے، کہہ گئے ہیں، بائی آئیں تو بٹھانا، میں ابھی آ تا ہوں!"

تسنیم ایک صوفہ پر بیٹھ گئی، خادمہ نے پوچھا،

"چائے لاؤں؟"

"نہیں ہم پی چکے ہیں!"

خادمہ بڑی بکی عورت تھی، باتیں کرتی تھی۔ دماغ چاٹ لیتی تھی آدمی کا، تسنیم نے سوچا، جب تک سیٹھ نہ آئیں، اسی سے باتیں کرکے جی بہلاؤں، وہ بولی،

"کیوں ری کیا تنخواہ ملتی ہے تجھے؟"

"تیس روپے ملتے ہیں"

"یہ تیرے سیٹھ یہاں کیوں رہتے ہیں؟"

انھیں اکیلا اچھا لگتا ہے!"

پھر تسلیم نے انور کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا،

"یہی لڑکے ہیں تیرے سیٹھ کے؟"

"جی! —— آج سیٹھ صاحب ان پر بہت خفا ہوئے!"

"کیوں؟"

"اپنے بیاہ کا نیوتہ دینے آئے تھے!"

"بیاہ کرنا چاہتے ہیں یہ تیرے سیٹھ زادے صاحب؟"

"جی! اس پر تو سیٹھ صاحب خفا ہوئے!"

"اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے؟"

"کوئی ناچنے گانے والی ہے، سنا ہے، کسی ناٹک کمپنی میں کام کرتی ہے!"

"ہاں تو؟"

"اسی سے بیاہ کرنے کو کہہ رہے تھے!"

"تو تیرے سیٹھ بگڑ گئے؟"

"ہاں بہت!"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

تو نالیاخ (نالائق) ہے، گھر سے نکال دوں، میری مونچھ نیچی کرنا چاہتا ہے، جائیداد سے محروم کردوں گا، .... زندگی بھر صورت نہیں دیکھوں گا اور نہ جانے کیا کیا؟"

"پھر یہ کیا بولے، تیرے سیٹھ صاحب کے بیٹے؟"

"بولئے کیا مان گئے!"

"مان گئے؟ کس طرح؟"

وعدہ کر لیا اس سے شادی نہیں کریں گے ــــ اوتھ میں کہتی ہوں انھیں

شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"کیوں ضرورت نہیں ہے؟"

"ہر روز تو وہ ایک نئی شادی کرتے رہتے ہیں ہمیشہ سے!"

"یہ بات ہے؟"

اور کیا!"

"بہت آوارہ ہیں؟"

"اے بی بی کیا پوچھتی ہو، نہ گھر کی نوکرانی چھوڑی، نہ پڑوس کی لڑکی، نہ دوست کی بیوی، جانے کیسی موہنی ہے آنکھ میں، جو عورت دیکھ لیتی ہے مرنے لگتی ہے، ہماری شبّو کو دیکھ لو!"

"شبّو کون؟"

نوکرانی ہے، اسی گھر میں پل پوس کر بڑی ہوئی ہے، ہو گی کوئی ۱۹، ۲۰ برس کی، جب تک انور میاں گھر میں رہیں گے، یہ انھیں کے کمرہ میں چھپیا چھپیا کے جائے گی، اور وہ بھلا کہاں آئے ہوئے مال کو چھوڑنے والے مثل مشہور ہے مالِ مفت دلِ بے رحم!"

تسنیم نے دانتوں تلے انگلی داب کر کہا،

"ارے غضب!"

"ایک غضب ؛ وہ اس کے سوا کرتے کیا ہیں ؛ پاس پڑوس، محلہ ٹولے کی کون لڑکی اور شہر کی کون رنڈی چھوڑی ہے انھوں نے؟ میں پوچھتی ہوں ——— لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ آنکھ ہیں موہنی ہے بھیّا کی ! جس سے آنکھ لڑا دیں وہ بچ کے نہیں جا سکتی !"

تسنیم نے بھولے پن سے کہا،

"یہ سب اس لیے ہے کہ گھر میں بیوی نہیں ہے، بیوی آجائے گی، یہ عادتیں خود بخود چھٹ جائیں گی، تیرے سیٹھ صاحب بھی بڑے ظالم ہیں دے دیتے اجازت!"

خادمہ نے زہر خند کے ساتھ کہا،

"یہ بیوی آجائے گی تو سدھر جائیں گے" سلمیٰ بٹیا بیوی نہیں تھیں تو کیا تھیں؛ کیسے کیسے ان پر فدا تھے، انھیں دیکھ کر شعر تک کہا کرتے تھے، پھر جو انھیں چھوڑا، تو وہ اللہ کی بندی مرتے مرگئی لیکن اس خدا کے بندے نے سسرال میں پاؤں نہیں رکھا۔"

"دل نہیں ملا ہوگا؟"

"بھاڑ میں جائے ایسا دل! میں پوچھتی ہوں، دل ملنا کیسے ہے؟ جب دیکھو جب سلمیٰ بٹیا کی یاد میں آہیں، ٹھنڈی سانسیں، رونا بسورنا، ان کی تصویر لیے بیٹھے ہیں، اسے چوم رہے ہیں، اور جب وہ مل گئیں، تو ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا گویا، ہم سے تم سے میل ہی نہ تھا گویا!"

"پھر تو سیٹھ صاحب نے اچھا کیا، جو شادی نہیں کرنے دی؟"

"اور کیا وہ بے چاری ایکٹرس بھی زندگی بھر روتی جھینکتی!"

"مجھے سیٹھ صاحب ——— پر بڑا ترس آتا ہے، کتنے نیک آدمی ہیں بیچارے!"

تسنیم خادمہ کی رگ رگ پہچانتی تھی، اس کے خوئے تنقید سے واقف تھی، سیٹھ صاحب کی تعریف، اس نے محض خادمہ کی زبانی، نئے معلومات حاصل کرنے کے لیے کی تھی، تیر نشانے پر بیٹھا، وہ مسکرائی

"ہاں بڑے نیک!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، کہہ تو رہی ہوں بڑے نیک ہیں، اور کیا کہوں؟"

تسنیم نے کہا،

"میں نہیں مانتی کچھ دال میں کالا ہے، تو چھپاتی ہے کچھ؟"

وہ بولی،

چھپانے کی کیا بات ہے، جو جیسا ہے، ویسا کہا جائے گا، جیسے باپ، ویسے پوت یہ ڈال ڈال، وہ پات پات!"

تسنیم نے حیرت کے ساتھ کہا،

"کیا کہہ رہی تو؟"

"بی بی میں جھوٹ نہیں کہتی، ایک ہی گھاگھ ہیں یہ بڑے میاں بھی!"

"سچ؟"

"اللہ قسم!"

"تو نے کیسے جانا؟"

"جانا کیسے؟ آنکھوں سے دیکھ کے!"

"کیا دیکھا تو نے؟"

"اب کیوں زبان کھلواؤ گی بی بی، چھوڑو بھی اس قصہ کو ـــــــ ابھی کل ہی کی بات ہے ـــــــ اونھ مجھے کیا میں نہیں کہتی!

تسنیم کو اشتیاق پیدا ہوا،

"کہہ بھی ڈالو!"

"کوئی کہہ ڈالے تو میری چوٹی مونڈ ڈالی جائے، نا بابا میں نہیں کہتی!"

"ارے پاگل ہوئی ہے، کہے گا کون؟ یہاں میں ہوں یا تو ہے، کیا میں کہہ دوں گی کسی سے؟"

"وہ آئے تھے داور سیٹھ ناٹک والے"

"تو! وہ کوئی عورت تو نہیں ہیں؟"

"وہ تو نہیں ہیں لیکن اپنے ساتھ ایک پٹاخہ بھی تو لائے تھے!"

"پٹاخہ؟"

"ہاں، ننھی گڑیا، ۱۶، ۱۷ برس کی چھوکری!"

"پھر کیا ہوا؟"

داور سیٹھ اسی کمرہ میں شراب پی کر سو گئے، اور سیٹھ صاحب تارا ـــــــ بس سمجھ جاؤ کہلوانی کیوں ہو!"

"ہاں سمجھ گئی! ـــــــ تو اس کا نام تارا تھا!"

"اونھ نام کا کیا، چاند، تارا، سورج، جو چاہیں رکھ دیں، بس آدمی کی بچی تھی، نہ چاند، نہ تارا!"

"داور سیٹھ آتے رہتے ہیں یہاں؟"

"آئیں گے کیوں نہیں، روپیہ لیا ہے تو سود نہیں دیں گے؟"

"روپیہ؟ سود؟"

"ہاں سیٹھ صاحب ۲۵ ہزار قرض لے گئے ہیں، یہ تارا جو آئی تھی سود ہی میں تو آئی تھی!"

خادمہ نے مسکرا کر تسنیم کی طرف دیکھا،

اور کیا ——— یہ گل کھلتے ہیں یہاں؟"

تسنیم کو شرارت سوجھی،

"تم تو بچی ہو اب تک؟"

بوڑھی خادمہ کے سوکھے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی، وہ مسکرانے لگی، اس نے کہا،

"تھا کبھی اپنا زمانہ بھی، اب تو وہ دن خواب ہو گئے!"

"وہ خواب تم نے کہاں دیکھے تھے؟ یہاں، کہیں اور؟"

اسی گھر میں پلی بڑھی، اسی میں خواب دیکھے، اسی میں آنکھ کھلی!"

موٹر کے آنے کی آواز آئی، تسنیم اسی طرح صوفے پہ بیٹھی رہی، قاسم سیٹھ آئے اور اسے دیکھ کر پھر سے جوان ہو گئے،

"اوہو مس تسنیم رونق افروز ہیں!

وہ بولی،

"آپ کو کیا، آپ تو کہیں اور مزے اڑا رہے تھے!

سیٹھ صاحب آ کر پاس بیٹھ گئے، کہنے لگے!"

"اتنی بدگمان ہو ہم سے؟"

وہ اٹھلا کر بولی،

بدگمانی کی اس میں کیا بات ہے؟ آپ کو اختیار ہے جہاں چاہے جائیے، جب چاہے آیئے، ہمیں کیا، ہم کون ہوتے ہیں آپ کے!"

بوڑھے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اس وقت اپنے آپ کو تاج الملوک اور تسنیم کو گل بکاؤلی سمجھ رہا تھا، اس نے کہا،

"یہ نہ کہو، تم میری بن سکو، یا نہ بن سکو، میں تمہارا ہوں، مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا،"

تسنیم نے محبت بھری نظروں سے سیٹھ صاحب کو دیکھا اور کہا،

"کسی کی آنکھ میں جادو ترے بیان میں ہے!"

بوڑھا اور زیادہ ریشہ خطمی ہو گیا، اُس نے کہا،

"بنا لو جتنا جی چاہے!"

وہ بولی

"جی یہ کام آپ کو آتا ہے، ہمیں نہیں —— دیکھ لیجئے کتنی دیر سے انتظار میں بیٹھے گھل رہے ہیں، اور آپ ہیں کہ گلچھرے اڑا رہے ہیں، نہ جانے کہاں سے آپ آئے اور چند میٹھی باتیں کر کے بے وقوف بنا لیا، ہم بن گئے —— اب بتلایئے کون بنتا ہے، کون بناتا ہے؟"

سیٹھ صاحب نے عالمِ تصور میں تسنیم کو اپنی گود میں بٹھا کر پوچھا

"کب تک یہ جلی کٹی باتیں کرو گی، معاف بھی کرو گی یا نہیں؟"

"وہ تو آپ کی صورت دیکھتے ہی کر دیا تھا،"

وہ اپنے مصنوعی دانتوں کو چمکاتے ہوئے بولے،

بڑی کینہ توز ہو، اب تک تمھارا دل صاف نہیں ہوا ہم سے، کہہ رہے ہیں، اب ایسی غلطی نہیں ہوگی!"

"کیسی غلطی؟"

"یہی کہ تم آؤ، اور ہم نہ ملیں"

تسنیم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،

"اور اگر نہ ہوا ایسا تو؟"

"جو چاہنا سزا دینا!"

"یہی تو آپ کو اطمینان ہے کہ میں سزا نہیں دے سکتی آپ کو!"

"کیوں؟ تمھیں پورا اختیار ہے، جو چاہو سزا دو!"

"اختیار تو ہے لیکن سزا دوں کس دل سے؟ آپ جانتے ہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی!"

بڑے جوش اور بے ساختگی کے ساتھ سیٹھ صاحب نے اور قریب کھسک کر کہا،

"معاف کر دو، معاف کر دو مجھے!"

تسنیم نے مخمور نگاہوں سے انھیں دیکھا اور کہا،

"ہٹیے بھی!"

اس نفرت میں بھی محبت کی جھلک نمایاں تھی، سیٹھ صاحب کو اپنی قسمت پہ ناز تھا، وہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے، ایک وہ لونڈا اکڑ رہا ہے، ہزاروں روپیہ اینٹھ لینے کے بعد جسے وہ ایکٹرس بے وقوف بنا رہی ہے۔ اور ایک میں ہوں، کہ مہ جبینوں کا سرتاج میرے سامنے بیٹھا ہے اور میری محبت کے گیت گا رہا ہے اور وہ بھی مفت

انھوں نے تسنیم کے پہلو سے پہلو ملاتے ہوئے کہا،

"اے شیریں! اپنے فرہاد کو معاف کر دے!"

تسنیم نے منہ بگاڑ کر کہا،

خدا نہ کرے آپ فرہاد ہوں ——— فرہاد پتھر سے سر پھوڑ کر مر گیا لیکن شیریں کو نہ پا سکا، اور پرویز نے اسے جیت لیا ——— میں آپ کے پاس بیٹھی ہوں، اور آپ اپنے تئیں فرہاد کہہ رہے ہیں؟ کہیے پرویز کہیے!"

سیٹھ صاحب نے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کہا،

"اے شیریں! اپنے پرویز کو معاف کر دے!"

"جائیے معاف کیا، لیکن اب ایسی غلطی نہ ہو!"

"نہیں ہو گی، واللہ نہیں ہو گی!"

"اچھا یہ بتائیے، آپ گئے کہاں تھے؟"

"یہ سوال تم پہلے کر لیتیں، تو یہ جھگڑا کیوں اٹھتا مفت میں!"

نیشنل بینک کے ڈائرکٹروں کا ایک فوری جلسہ تھا، اس میں گیا تھا، گیا کیا تھا جانا پڑا، ——— سچ سچ کہنا، تم کیا سمجھ رہی تھیں، میں کہاں گیا تھا؟"

"کچھ نہیں؟"

"نہیں تم ضرور سمجھ رہی تھیں، یہ کہیں موج اڑانے گیا ہے، سچ کہنا!"

تسنیم نے ایک خاص انداز میں گردن ہلا کر تائید کی، سیٹھ صاحب نے اس کی تھوڑی کے نیچے اپنا لرزتا ہوا پنجہ رکھا اور منہ اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

بڑی بدگمان ہو تم ——— میں تمہارے سوا کسی حور پر بھی نظر نہیں ڈال سکتا، تم مجھے سمجھتی کیا ہو؟"

نسیم کا جی تو چاہا کہہ دے

"آپا جان!"

لیکن ٹال گئی، اس نے کہا،

"کچھ بھی نہیں!"

سیٹھ صاحب بھی اس وقت موج میں تھے،

"میں تمہاری نظر میں کچھ بھی نہیں؟ یہ وقعت ہے تمہاری نگاہ میں میری؟"

گھڑی دیکھ کر نسیم اٹھ کھڑی ہوئی،

"اُفوہ، بہت دیر ہو گئی، اب میں جاتی ہوں!"

"ابھی سے، کہاں؟"

"تھیٹر، میرا پارٹ ہے آج!"

"ہم بھی چلیں گے، تمہارا پارٹ ہو، اور ہم نہ جائیں؛ لیکن ابھی تو بہت وقت ہے!"

"وقت آپ کے لیے ہے، میرے لیے نہیں، مجھے ریہرسل بھی تو کرنی ہے! میں چلتی ہوں، آپ آئیے، انٹرول میں ملاقات ہو گی، میرے کیبن میں آجائیے گا!"

"ضرور آؤں گا، لیکن کھانا تو کھا لو!"

"نہیں، جس روز رات کو کام کرنا ہوتا ہے، میں کھانا نہیں کھاتی، یوں نیند بھی نہیں ستاتی اور طبیعت بھی ہلکی رہتی ہے!"

سیٹھ صاحب نے اپنایت کی برہمی کے ساتھ کہا،

"لیکن تمھیں اتنی مشقت اُٹھانے کی کیا ضرورت کیا ہے؟ یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتیں تم؟"

"چھوڑ دوں گی لیکن ابھی نہیں!"

وہ چلی گئی، اور سیٹھ اس کی خوشبو سے اپنا مشامِ جاں معطر کرنے لگے!

باب ۲۹

کشاکش

انور نے باپ سے وعدہ تو کر لیا کہ ایکٹرس سے شادی نہیں کرے گا لیکن اب سوچ رہا تھا تسنیم کو منہ کیا دکھائے گا، ایک طرف جائیداد اور دولت تھی، دوسری طرف تسنیم کا حسن وجمال دامن کھینچ رہا تھا، اس کے لئے دولت سے دستبردار ہونا بھی مشکل تھا اور تسنیم کو چھوڑ دے یہ بھی اس کے بس میں نہیں تھا، اسے قدرت کی طرف سے ایسا حسن مردانہ ملا تھا کہ واقعی جو دیکھ لیتا تھا فدا ہو جاتا تھا، اور یہ بات —— اس پر بالکل صادق آتی تھی کہ تمہیں جو دیکھ لیتا ہے وہ شیدا ہو ہی جاتا ہے، جس عورت پر اس نے نظر ڈالی، وہ پھر اس کے پھندے سے بچ کر نہ جا سکی، یہ کھیل اس نے نوشابہ سے شروع کیا تھا اور تسنیم پر ختم ہو رہا تھا، اس نے نوشابہ سے سچ مچ محبت کی تھی، لیکن کسی حد تک وہ تسنیم سے سچ مچ محبت کر رہا تھا، لیکن غیر معمولی، پہلی محبت ہلکی اور کمزور تھی، دوسری محبت طوفان کی طرح پر خروش اور پر جوش تھی، نوشابہ کو بھلا دینے میں وہ کامیاب ہو گیا، تسنیم کو بھلا دینا، اس کے بس سے باہر تھا، وہ بچپن کا کھیل تھا، یہ جوانی کا فیصلہ، وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور، یہ چٹان کی طرح مضبوط!

باپ کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ چلا تو آیا لیکن جب اپنے کمرہ میں پہنچا تو دل میں ایک خلش سی، ایک جھجھک سی ہونے لگی تسنیم کا پیارا سدا بہار مکھڑا بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آتا تھا، اور پوچھتا تھا، یہی شرطِ وفا تھی، یہی وعدہ تھا؟ اسی برتے پر تم مجھے اپنی جورو بنانے پر تلے ہوئے تھے؟ منہ کیوں چھپائے ہوئے ہو آؤ میں تمہاری منتظر ہوں!

انور بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگا، رات کے دو بج چکے تھے، مگر نیند کا کہیں پتہ نہیں تھا، وہ بیتابی اور بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا، وہ دیوانگی اور جوش کے عالم میں اپنا سر پھوڑ رہا تھا، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ تسنیم کو چھوڑ دوں عجیب بات یہ تھی کہ تسنیم کے ساتھ ساتھ زرینہ کا خیال اس کے دل میں چٹکیاں لیتا تھا، وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتا تھا، وہ نہیں چاہتا کہ زرینہ ایکٹرس بنے ناچے گائے، لگائے، شوخ نظروں کا ہدف بنے، تماش بینوں کی گود میں بیٹھے، ان کے پہلو میں راتیں بسر کرے، اس کی تمنا تھی کہ وہ پڑھے، ترقی کرے اور ایک شریف اور پاک نہاد لڑکی کی طرح جوان ہو، جوانی کی سرحد پر پہنچے جوانی کی منزلوں سے گزرے، تسنیم سے دستبردار ہونے کے معنی یہ تھے کہ زرینہ بھی ہاتھ سے گئی، وہ اس کا جوڑوں کی طرح معصوم چہرہ، وہ اس کی بھولی باتیں، وہ اس کا پھول سا مکھڑا، وہ اس کی دل میں کھب جانے ڈالی آواز، آہ! یہ پاک اور معصوم بھی زہریلی ناگن بنا دی جائے گی؟ آہ! کیا اس پاک اور نیک چہرے پر بھی آوارگی کی سرخی جھلکے گی؟

زرینہ اس کی بیٹی نہیں تھی، لیکن وہ اسے بیٹی کی طرح چاہنے لگا تھا، وہ اس سے بہت مانوس تھی، جتنا جتنا وہ مانوس ہوتی جاتی تھی، اتنی ہی اتنی انور کے دل میں اس کی محبت جڑ پکڑتی جاتی تھی۔ اب حالت یہ تھی کہ تسنیم کے ساتھ زرینہ کا اور زرینہ

کے ساتھ تسنیم کا خیال اس کے دل میں آتا تھا،

وہ اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ محبت حماقت ہے، حسن خداداد عام ہے، وہ صرف تسنیم کی ذات تک محدود نہیں ہے جسن سے لطف لینا ہے، حسن کی لذت سے شاد کام ہونا ہے تو تسنیم اور نوشابہ، سلمیٰ اور شبو، رضیہ اور سلیمہ کے درمیان تفریق بیکار ہے، ہر حسین عورت اس قابل ہے کہ اس سے دل لگایا جائے، ہر حسین چہرہ اس قابل ہے کہ اسے چوما جائے ہر حسین مکھڑا اس قابل ہے کہ اسے دل کا مکین بنایا جائے لیکن اسی وقت تک، جب تک اس سے زیادہ حسین ہستی نہیں ملتی، آب آخر تسنیم برخاست ہے کوئی نیا حسین ملے گا، وہ پہلے حسن کو منسوخ کر دے گا، نوشابہ کو سلمیٰ نے، سلمیٰ کو عشرت اور نرگس وغیرہ نے منسوخ کر دیا، اور تسنیم نے ان سب پر خطِ نسخ کھینچ دیا، یہاں آکر طبیعت رک جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، اب قدرت تھک گئی ہے، اب وہ کوئی اور حسین چہرہ پیش ہی نہیں کر سکتی، تسنیم کو بنانے کے بعد قدرت نے تخلیق حسن کا کام ہی چھوڑ دیا، یہی وجہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی صورت نہیں جچتی، اس کی اداؤں میں اداکاری نظر نہیں آتی، ہے، میں محبت سے زندگی بھر بچا گا، لیکن اب اس نے ایسا جکڑا ہے کہ گلو خلاصی کی صورت ہی نظر نہیں آتی، ایسا معلوم ہوتا ہے، تسنیم اگر مجھے نہ ملی تو میں زندہ نہ رہوں گا، زندگی کا تصور اب اس کے بغیر کیا ہی نہیں جاتا، نہیں یہ نہیں ہو سکتا، میں تسنیم کو نہیں چھوڑ سکتا، میں ابا جان سے بغاوت کر دوں گا اور کہہ دوں گا ان سے کہ وہ مجھے شوق سے جائیداد سے محروم کر دیں، عاق کر دیں، جو کچھ میرے پاس ہے سب چھین لیں لیکن تسنیم کو مجھے دے دیں، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا، اس کے بغیر ایک لمحہ، اور ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا، وہ میری زندگی اور روح بن چکی ہے، وہ میرے دل کی مالک ہے، اور

وہ ننھی زرینہ ؟ اوہ! میری بچی کتنی شوخ لیکن معصوم، کتنی حسین لیکن کتنی پاک! کتنی تیز لیکن کتنی شریف، کتنی ذہین لیکن کتنی نیک! میں اسے اس سے کہیں زیادہ چاہتا ہوں، جتنا باپ اپنی اولاد کو چاہتا ہے۔ ابا جان مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن ہرگز اتنا نہیں چاہتے جتنا میں زرینہ کو، حالانکہ وہ میری اولاد نہیں اور میں اُن کا لختِ جگر ہوں، ناممکن میں زرینہ اور تسنیم کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا ——— مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں نے کیوں والد کے سامنے کمزوری دکھائی؟ کیا میرا عشق کھوٹا ہے، کیا میں روپیہ کو تسنیم پر ترجیح دیتا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں، میں تسنیم کی ایک ادا پر، دولت دوعالم قربان کر سکتا ہوں، میں تسنیم کی خاطر، ساری دُنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، گھر، خاندان، دولت جائیداد، باپ، یہ سب پتھر ہیں، اور میں اگر تسنیم کو چاہتا ہوں تو ان پتھروں کو مجھے راستہ سے ہٹانا ہی پڑے گا!،،

گھڑی نے چار بجائے؛ وہ ٹہلتے ٹہلتے چونکا، اوہ! رات بیت گئی اور میں کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے تسنیم میری ہے، میں اس کا ہوں، جب تک ہم دونوں زندہ ہیں، ہمیں کوئی ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا، نہ سماج، نہ خاندان، صرف موت کا بے رحم ہاتھ ہی ہم میں جدائی پیدا کر سکتا ہے، قاسم سیٹھ کے سامنے جس انور نے تسنیم کو چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ کوئی دوسرا انور ہوگا، میں نہیں ہو سکتا!،،

میز پر ایک چھوٹے سے فریم میں تسنیم کی مسکراتی ہوئی تصویر رکھی تھی، انور بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا، نہ جانے کیا خیال آیا کہ اٹھا اور اٹھ کر الماری کی چھت سے وہ پرانا البم اٹھا لایا جس میں نوشابہ کی تصویر لگی ہوئی تھی، اس نے وہ تصویر البم سے نکال لی البم پھر الماری کی چھت پر رکھ دیا، اور نوشابہ کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا، ایک

لڑکی تھی جو جوان ہو رہی تھی، دوسری عورت تھی جو سرشار جوانی کی مالک تھی، دونوں حسین تھیں، اور غضب کی حسین تھیں، شاید نوشابہ پوری جوان ہو کر تسنیم کی طرح بن گئی، شاید تسنیم اپنی دوشیزگی کے زمانہ میں نوشابہ کی سی ہو لیکن صرف لیکن صرف صورت سے، یا صرف حسن سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز ہے سبھاؤ، وقار نسوانی، ناز و ادا غمزہ خونریں اور عشوۂ ترکانہ۔ نوشابہ مجھے یاد ہے، ایک بھولی بھالی، دیہاتی لڑکی تھی اور تسنیم میرے سامنے ہے، قیامت! وہ بیچاری بہت ترقی کرتی تو ایک وفادار بیوی بن جاتی، اور یہ — یہ تسنیم بڑھتا ہوا، مچلتا ہوا طوفان ہے، جس کے گرداب کی لپیٹ میں زندگی آجائے تو بچ ہی نہیں سکتی اور پھر یہ طوفان ابھی اور بڑھے گا، ابھی اور مچلے گا، مجھے طوفان کے تھپیڑوں میں جو مزہ آتا ہے، پرسکون زندگی میں نہیں آتا، نوشابہ طوفان کبھی نہ بن سکتی، اور تسنیم طوفان ہے اور میں اسی طوفان میں مگن ہوں، یہ طوفان ہے، جو زندگی کے سوز اور تپش سے لذت آشنا کرتا ہے، وہ سکون نہیں، جس کے بعد موت آجاتی ہے!

انور نے نوشابہ کی تصویر پھاڑ کر پھینک دی، تسنیم کی تصویر کو اٹھایا، آنکھوں سے لگایا، پھر اسے چوما جیسے کوئی مرید اپنے مرشد کی تصویر کو بوسہ دیتا ہے، اتنے میں شبو چائے لے کر آگئی، اب بالکل سویرا ہو چکا تھا، سورج مشرق کے دریچے سے نقاب الٹتا ہوا نمایاں ہو رہا تھا۔ انور نے ایک نظر شبو پر ڈالی اور ایک چائے کی ٹرے پر،

"یہ کیا ہے؟"

وہ مسکرائی،

انور کی تیوری پر بل پڑ گئے

"واپس لے جاؤ، کس نے تم سے کہا تھا چائے لانے کو؟"

اس کا منہ اتر گیا، وہ اُلٹے پاؤں چائے لے کر واپس گئی، آج پہلی مرتبہ انور نے اُسے ڈانٹا تھا، اس گھر میں ہر شخص اسے ڈانٹتا تھا لیکن وہ اِس کان سنتی تھی، اُس کان اُڑا دیتی تھی، مگر یہ ڈانٹ اس کے کانوں نے نہیں دل نے سنی تھی، اور جو بات دل سے پار ہو جاتی ہے، وہ سنی کی اَن سنی نہیں کی جا سکتی، یہ ڈانٹ تیر کی طرح لگی تھی، اس کے دل پر جا کر، لیکن وہ ملازمہ تھی، وہ کوئی شکوہ نہیں کر سکتی تھی، غریب شبو!!

باب ۳۰

عہد و پیمان

انور سخت قلبی اور دماغی اذیت میں مبتلا تھا، وہ تسنیم سے شادی کر لینے کا تہیہ کر چکا تھا، لیکن یہ ارادہ کس طرح پورا ہو، دن اسی فکر میں کٹ رہے تھے، رات اسی سوچ میں گذر رہی تھی، کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا تھا،

اسی کشمکش خیال کے باعث وہ کئی روز سے تسنیم کے ہاں نہ جا سکا تھا، تسنیم اس کے نہ آنے کی وجہ سمجھ رہی تھی اور خاموش تھی، وہ تقریباً ہر روز قاسم سیٹھ کی دولت سرا پر جاتی تھی، ہنستی ہوئی آتی تھی، کبھی کبھی داور سے بھی وہاں مڈبھیڑ ہو جاتی تھی، لیکن وہ اسے دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے، وہ اس سے بہت خفا تھے، لیکن دل ہی دل میں دعا مانگا کرتے تھے کہ کہیں وہ خفا نہ ہو جائے، وہ خفا ہوئی تو تھیٹر ختم ہو جائے گا، اُس کی رونق ختم ہو جائے گی، وہ اس سے بات نہیں کرتے تھے لیکن اُس کی ہر بات مانتے تھے، ان کی اس بے بسی کو بھی وہ خوب سمجھتی تھی اور مسکرا کر ٹال جاتی تھی، ایسے معاملات پر غور و فکر کرنے کی وہ عادی نہیں تھی۔

قاسم سیٹھ روز بروز اس سے قریب ہوتے جا رہے تھے، ان کی دولت اس کے لیے وقف تھی، ان کا دل صرف اسی کے لیے دھڑکتا تھا، وہ ان کے لیے معجونِ فلک سیر

بن گئی تھی، بلکہ شراب دو آتشہ، ایسی شراب جسے وہ آنکھوں میں پیتے تھے اور مست ہو جاتے تھے، انور عاشق تھا، داور نیا زمندا ور سیٹھ صاحب فدائی شاید وہ ان سب سے کھیل رہی تھی، وہ سیٹھ صاحب کی دولت پر مالکانہ تصرف رکھتی تھی لیکن سیٹھ صاحب اس پر ذرا بھی تصرف نہیں رکھتے تھے۔ داور اپنی آمد کا بڑا حصہ اس پر نچھاور کر دیتا تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ اس سے بے تکلف ہو سکے انور بھی اس پر بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا لیکن اس کی دسترس سے بھی وہ باہر تھی، یہ کتنا دلچسپ کھیل تھا، مداری کا کھیل، وہ خود جب موج میں ہوتی تو یہی کہا کرتی تھی، میں مداری ہوں، رنگ برنگ کے سانپ، میری جھولی میں بند ہیں، یہ میری سریلی لے پر سر دھنتے اور ناچتے ہیں۔ میں نے ان کے دانت توڑ دیئے ہیں یہ بڑے زہریلے ہیں، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، انور سیٹھ صاحب اور داور سب سانپ تھے، جن کے دانت اکھاڑے جا چکے تھے اور اس کی جھولی میں بند تھے، جو اُسے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، جن کا کام صرف یہ تھا کہ اس کی سریلی لے سنیں، سر دھنیں اور ناچیں، ان میں سے کوئی بھی اسے کاٹ نہیں سکتا تھا، اور اگر اپنے پوپلے منہ سے کاٹنے کی کوشش بھی کرتا تو سر کچل دیا جاتا اس کا۔

رات کا وقت تھا اور وہ سیٹھ صاحب کے سامنے جام شراب بنی بیٹھی تھی سیٹھ صاحب نے کہا،

"تمہارے آنے میں دیر ہوتی ہے تو دل گھبرانے لگتا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی،

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

ابھی ابھی داور بھی آگیا تھا اور شریکِ مجلس تھا، اُس نے پوچھا

"کیا مطلب؟"

وہ بولی،

"آپ مطلب پوچھنے والے کون؟"

اس نے رفع شر کے لیے فوراً الفاظ واپس لے لیے

"کوئی نہیں!"

تسنیم نے بگڑ کر کہا،

"آپ میرے اور سیٹھ صاحب کے تخلیہ میں کیوں حارج ہوتے ہیں؟"

تخلیہ کا لفظ سن کر سیٹھ صاحب ذرا چونکے، کچھ جھینپے بھی، لیکن ہمت سے کام لے کر مسکرانے لگے، داور نے پوچھا،

"تو کیا چلا جاؤں؟"

وہ بولی،

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آپ کو خود ہی خیال کرنا چاہیے تھا!"

داور، بڑا کاروباری آدمی تھا، وہ اپنی "توہین" پر ہزاروں روپیہ کی روز کی آمدنی پر لات نہیں مار سکتا تھا، تسنیم کی تلخیاں شہد کی طرح پی گیا، اور بولا،

"اچھا بھئی خفا مت ہو، جاتے ہیں، اب کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی!"

وہ چلا گیا، تسنیم نے سیٹھ صاحب کو گدگدایا،

"آپ بھی بڑے وہ ہیں!"

سیٹھ صاحب کا دل ناچنے لگا، انھوں نے کہا،

میں تو کچھ نہیں ہوں بس تمہارا فدائی ہوں، اشارہ ہو تو گردن کاٹ کر رکھ دوں تمہارے قدموں پر!"

تسنیم نے سنجیدگی کے ساتھ کہا

"مجھے یقین ہے!"

سیٹھ صاحب کی باچھیں کھل گئیں، بڑے جوش کے ساتھ بغیر ساز، سازندے کے انھوں نے گانا شروع کر دیا،

اُلفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بیقرار

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی!

تسنیم نے کہا،

"بس خاموش رہیئے آپ کو دوسروں کے جذبات بھڑکانے میں بڑا مزہ آتا ہے!"

اگرچہ سیٹھ صاحب کے جذبات کوشش کے باوجود ذرا بھی نہ بھڑک سکے لیکن انھوں نے بھڑکتے ہوئے جذبات کا بھبھوکا بن کر کہا،

"تسنیم، تم بڑی ظالم ہو، بڑی ظالم!"

"اور آپ؟"

اپنی شیریں کا فرہاد ——— نہیں پرویز!"

"لیکن اپنے پرویز کے محل میں شیریں ہر روز مہمان کی طرح آتی ہے اور چلی جاتی ہے اس کا اس محل پر، اپنے پرویز پر کوئی حق نہیں! ——— کیوں جناب پرویز صاحب!

سیٹھ صاحب شیر ہو کر بولے،

لیکن یہ خطا پرویز کی نہیں شیریں کی ہے!" —

"کیوں کر؟"

سیٹھ صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ کہا،

"کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں، شادی کر لو مجھ سے، مگر تم سنتی کب ہو؟"

"کر تو لیتی شادی مگر مجھے آپ پر ترس آتا ہے!"

"کیوں؟"

"آپ پریشان بہت ہو جائیں گے!"

"کیوں پریشان ہو جاؤں گا؟"

"گھر والے مخالفت کریں گے!"

"کسی کی مجال نہیں"

تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولی،

"ولیعہد صاحب آپ کے روٹھ جائیں گے ——— پھر؟"

"وہ میرا بیٹا ہے، باپ نہیں، وہ خود بھی تو ایک ایکٹرس سے شادی کرنے پر تلا ہوا تھا، پھر اگر میں کسی شریف ایکٹرس کو اپنی رفیقۂ حیات بنا لوں تو اسے مخالفت کرنے کا کیا حق ہے؟"

"یہ تو سچ ہے ——— تو کیا وہ کسی ایکٹرس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"جی ہاں!"

"پھر کیا ہوا؟ آپ نے منع کر دیا؟"

"ہاں منع کر دیا!"

"کیوں؟"

"دو بدمعاش جب مل جائیں گے، تو قیامت بن جائیں گے، ایک تو وہ ایکٹرس خود کیا کم ہوگی، دوسرے ہمارے صاحبزادے. بدمعاشوں کے سرتاج کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا،

"کون ہے وہ ایکٹرس؟"

"ہوگی کوئی!"

"آپ نے اسے بدمعاش کیسے کہہ دیا، شاید وہ بھی میری طرح شریف ہو؟"

کیسی باتیں کرتی ہو تسنیم؟ تمہارا مقابلہ کر سکتا ہے کوئی؟ —— ہاں تو بتاؤ شادی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"شادی تو کر دوں گی!"

"لیکن کس سے؟"

"آپ ہی بتائیے کس سے؟ جائیے آپ کو اختیار دیئے دیتی ہوں، جس سے چاہیے میری شادی کر دیجیے!"

"دیکھو مکر نہ جانا!"

"واہ بھلا مکروں گی کیوں؟"

"اب تاریخ بھی تم ہی مقرر کر دو!"

"تاریخ ابھی سے!"

"ہاں اور کیا؟ نیک کام میں دیر کیوں؟"

"لیکن یہ تو بتائیے میری لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟"

سیٹھ صاحب ذرا چونکے،

"لڑکی بھی ہے کوئی؟"

"ہاں کیوں نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ۷، ۸ برس کی ہے۔
"تو اس کے لیے فکرمند کیوں ہوتی ہو؛ جیسی تمھاری لڑکی ویسی میری!"
"آپ اس کے لیے کیا کریں گے؟"
"جو کہو!"
"آپ ہی بتلایئے؟"
"میں نے طے کیا ہے کہ اپنی نصف جائیداد تو انور کو دوں گا، لاکھ نالائق سہی مگر اولاد ہے، اور آدھی تم کو!"
"صرف زبانی؟"
"تم میری زبان کا اعتبار نہیں کرتیں؟ قول مرداں جاں دارد!"
"وہ میں نے مانا، لیکن بات پختہ ہونی چاہیئے!"
"سیٹھ صاحب نے بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر کہا،
"میں تمھیں دھوکا نہیں دیتا (کاغذ جیب سے نکال کر) یہ ہے میرا وصیت نامہ، جو عدالت میں داخل ہو چکا ہے اور جس کی نقل یہ ہے۔ آدھے کی مالک تم ہو، آدھے کا انور!"
تسنیم نے محبت بھری نظروں سے دیکھ کر سیٹھ صاحب سے کہا،
"خدا آپ کو زندہ رکھے، دستاویز لکھ دیتے۔ وصیت نامہ کیوں لکھا، میرا تو یہ لفظ سن کر دل ہولنے لگتا ہے:"
وہ مسکرائے،
"وصیت نامہ تو آدمی کو ہر وقت تیار رکھنا چاہیئے، خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان؟"

"تو آپ کون سے ایسے بوڑھے ہیں؟"

"کہہ تو رہا ہوں، خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان!"

کچھ دیر خاموشی رہی، سیٹھ صاحب نے پھر کہا،

"تو بولو، اپنا وعدہ کب پورا کرو گی؟"

"وہی شادی کا؟"

"ہاں!"

"اگر میں انکار کردوں تو آپ وصیت نامہ منسوخ کردیں گے؟"

"ہرگز نہیں، یہ وصیت نامہ شادی کی قیمت نہیں ہے، محبت کا تحفہ ہے!"

"شادی میں کر لوں آج ہی، لیکن یہ بتایئے، آپ میرے اوپر کچھ پابندیاں تو نہیں عاید کریں گے؟"

"پابندیاں کیسی؟"

"یہی کہ اس سے ملو، اس سے نہ ملو، یہ کام کرو، وہ نہ کرو!"

"ہرگز نہیں!"

"اداکاری کر سکوں گی؟ بڑا شوق ہے مجھے اداکاری کا!"

سیٹھ صاحب نے سوچا پھر فرمایا،

"اداکاری کی اجازت، میں نہیں دے سکوں گا"

"کیوں؟ —— ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے، ابھی کیا کہنے لگے؟"

"اصولی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے تمہاری اداکاری پر، لیکن اپنے دل کو کیا کر دوں؟ وہ اداکاری کی حالت میں بھی دوسرے کے پہلو میں تمہیں دیکھ کر جلتا ہے

جی چاہتا ہے چاقو مار دوں سالے کے!"

نسیم کھلکھلا کے ہنس پڑی، اُس نے کہا

"واہ!"

وہ بولے،

"واللہ!"

"پھر کام کیسے چلے گا؟"

"میری خاطر تمھیں یہ ایثار کرنا پڑے گا!"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی،

"یہ بات ہے تو ماننا ہی پڑے گا، لیکن آپ نقل کو اصل کیوں سمجھتے ہیں؟"

"میری کچھ فطرت ہی ایسی ہے!"

"اچھا آپ کی یہ شرط منظور، لیکن ایک شرط آپ کو میری ماننی پڑے گی!"

"منظور ہے، کہیئے!"

یہ شادی چار چھ مہینے کے لیے ملتوی کرنی پڑے گی!"

وہ پریشان ہو کر بولے،

"اتنی مدت کیوں؟"

ایک ڈرامہ میں نے خود لکھا ہے "آپ بیتی" یہ مکمل ہولے پھر!"

کون سی بات ہے اس ڈرامہ میں؛ بتاؤ بھی!"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا، اسٹیج پر اور اسکرین پر جھوٹی کہانیاں پیش کی جاتی ہیں، یہ

ایک سچی کہانی ہے، بڑی، دلچسپ بڑی عبرت انگیز، بڑی سبق آموز، میں اپنے ذ...

دماغ کی ساری قوت اسے مکمل کرنے میں صرف کیے دے رہی ہوں، یہ کام کر دوں پھر میں آپ کی ہوں، آپ میرے ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکے گی!"

سیٹھ صاحب ان الفاظ سے بہت متاثر ہوئے انھوں نے کہا،

"اچھی بات ہے لیکن یہ کام جلد از جلد ختم کر ڈالو، اب ایک دن بھی تمھارے بغیر کاٹے نہیں کٹتا مجھ سے!"

"یہی میری حالت ہے، فرق یہ ہے کہ آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں، میرے منہ پر مہر لگی ہے، آپ مرد ہیں، میں عورت ہوں، مرد دل کی بھڑاس ہر وقت نکال سکتا ہے اور عورت کی شان یہ ہے کہ ضبط کا دامن کبھی بھی نہ چھوڑے!"

سیٹھ صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"مجھے حیرت ہے، تم ایکٹرس کیسے بن گئیں؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ترقی کرتے کرتے اس درجہ پر پہنچی، پہلے عصمت فروش تھی، اب ضمیر فروش ہوں ——— اداکار ضمیر فروش ہی تو ہوتا ہے!"

بدپائی کے ساتھ تسنیم نے یہ بچی باتیں کہہ دیں جو بڑی حد تک سیٹھ صاحب کو کڑوی لگیں، انھوں نے اس کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا،

"تم میرا مطلب نہیں سمجھیں!"

"یعنی؟"

"میں پوچھ رہا تھا، تم جیسے بلند کردار کی عورت، اتنی حسین و جمیل، اتنی شائستہ اور تعلیم یافتہ، اتنی شریف اور پاکیزہ، اس بری لائن میں کیسے آ پھنسی؟ تمھیں تو کسی تاج کا نگیں ہونا چاہیئے تھا!"

"تاج اب ملا ہے، بن جاؤں گی اس کا نگینہ ——— لیکن اب تک، جو لوگ ملے، دھوکے باز اور کمینے تھے، جن کا مشغلہ یہی ہے، کہ عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنائیں"

"سچ کہتی ہو تسنیم!"

"سیٹھ صاحب آپ نہیں جانتے، آپ کی قوم ہم عورتوں پر کتنے ظلم کرتی ہے، ہم نے اتنے ظلم سہے ہیں کہ زندگی کے مقابلہ میں موت ہمیں پیاری ہے، یہ طاعون یہ ہیضہ یہ قحط، یہ زلزلے، ان چیزوں سے آپ لوگ ڈرتے ہوں گے، ہم تو صرف ایک چیز سے ڈرتے ہیں، اور وہ ہے مرد! ہلاکو، چنگیز، ہٹلر! ——— قحط، وبا، زلزلہ، یہ چیزیں ہمارے لیے نعمت ہیں، ہم ان سے بھاگتے نہیں، ان کی تمنا کرتے ہیں، دعا مانگتے ہیں، ان کے لیے یہ ہماری مشکل کشا ہیں، یہ ہمیں زندگی کی لعنت سے آزاد کر دیتی ہیں، اور موت کی گود میں چین کی نیند سلا دیتی ہیں۔

عورت کا جو رخ بھی دیکھیے، مظلومیت کے سوا کچھ نہیں ہے، بیوی کی حیثیت سے اس پر جو ستم ٹوٹتے ہیں، بیٹی کی حیثیت سے اس پر جو ظلم ہوتے ہیں، بہن کی حیثیت سے جس طرح وہ اپنے حق سے محروم رکھی جاتی ہے، یہ عورت کے دل سے پوچھیے، عورت کو اگر کچھ سکون اور عافیت ہے تو اس بالاخانہ پر جسے رنڈی کا کوٹھا کہا جاتا ہے، میں بھی اپنی دوسری ہم پیشہ بہنوں کی طرح مردوں کے ظلم سہتے سہتے، رنڈی کے کوٹھے پر پہنچی وہاں سے چھلانگ لگا کر اسٹیج پر آئی، اب آپ سہارا دے رہے ہیں، دیکھیے قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

سیٹھ صاحب یہ داستان سن کر بہت متاثر ہوئے، انھوں نے کہا،

"تسنیم میں جانتا ہوں تم نے مردوں کے بارے میں جو کچھ کہا سچ کہا، اپنے متعلق

میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تم جاں نثار شوہر پاؤ گی!"

"دیکھوں گی، اب تو دریا میں پاؤں ڈال دیا ہے، ایک تجربہ یہ بھی سہی؟"

"انشاءاللہ یہ تجربہ بہت کامیاب رہے گا"

کون جانتا ہے غیب کے پردہ میں کیا ہے؟"

(مسکراکر) "میں جانتا ہوں"

"بتلائیے؟"

"عیش اور محبت ان دونوں چیزوں سے تمھارا مستقبل مرکب ہے"

"آپ اپنی وضع پر قائم رہے تو امید مجھے بھی یہی ہے"

مجھے تم کبھی بے وفا نہ پاؤ گی تسنیم ــ"

سیٹھ صاحب آگے بڑھے تسنیم پیچھے ہٹی،

"ابھی نہیں!"

اور وہ چلی گئی،

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر!

باب ۳۱

تقاضا

کئی روز تک انور نے تسنیم کو منہ نہیں دکھایا، پھر آیا تو خاموش سا معلوم ہوتا تھا، عشق و محبت کا چڑھا ہوا دریا اُتر چکا ہے، صرف وضع نباہنے اور رسم پوری کرنے کے لیے آجاتا ہے، وہ آتا تھا، گھنٹوں اور پہروں بیٹھتا تھا، لیکن ایسے وقت جب تسنیم نہ ہو، وہ زرینہ سے کھیلتا تھا، اُس کی پیاری پیاری باتیں سنتا تھا، اُسے کہانیاں سناتا تھا، شہر کی سیر کراتا تھا، تحفے لا لاکر دیتا تھا، گراموفون پر نئے نئے ریکارڈ سناتا تھا، اس سے وقت بچتا تو زہرہ بائی سے باتیں کرتا تھا، جب تسنیم کے آنے کا وقت ہوتا تھا، کھسک جاتا تھا یا اگر کبھی اس سے مڈبھیڑ ہوتی تو اس طرح کہ وہ کمپنی جانے کے لیے نیچے اتر رہی ہے، یہ زرینہ سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا ہے زینہ پر سوائے علیک سلیک کے کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی، تسنیم پوچھتی تھی، آپ ایسے وقت کیوں آئے ہیں جب میں جا رہی ہوں، اور وہ جواب دیتا تھا، کوئی حرج نہیں، میں تو روز آتا ہوں، کل سہی، کل کریں گے اطمینان سے باتیں، وہ مسکراتی ہوئی نیچے اتر جاتی تھی، یہ فکرمند سا اوپر چڑھ جاتا تھا۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ انور حسب معمول آیا، اور تسنیم حسب معمول کمپنی گئی ہوئی

تھی، وہ حسبِ معمول زرینہ کے ساتھ کھیلنے لگا، اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی دی، نظر اُٹھا کر دیکھا تو تسنیم سامنے کھڑی تھی، وہ گھبرا گیا، اُس نے کہا،

"تم کہیں گئی تھیں!"

"جی ہاں، لیکن آ گئی، آپ کو اگر میری موجودگی کھل رہی ہو تو واپس چلی جاؤں!"

"کیا کہتی ہو تسنیم، ایسا ہو سکتا ہے کہیں، تمھاری موجودگی اور مجھے کھلے گی؟ یہ پروانہ شمع سے گھبرائے گا؟ چکور چاند سے منہ موڑے گا!"

تسنیم قریب کی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی،

"باتیں نہ بنائیے، آپ مجھ سے منہ چھپا رہے ہیں!"

"میں؟"

"جی ہاں آپ!"

"یہ غلط فہمی ہے تمھاری!"

"جی نہیں، یہ نکتہ رسی ہے میری ——— میں یہ بھی خوب سمجھتی ہوں کہ آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں!"

انور پھیکی ہنسی ہنسا، اس نے کہا،

"میرے بارے میں تم وہ باتیں جانتی ہو، جو خود میں بھی نہیں جانتا؟"

"بنانے کی کوشش نہ کیجیے!"

"میں تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"آپ اب پہلے کی طرح آتے کیوں نہیں؟"

"روز آتا ہوں، زرینہ سے پوچھ لو!"

"زرینہ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں آپ آتے ہیں لیکن میری
عدم موجودگی میں!"
"ہاں یہ عجیب اتفاق پیش آ رہا ہے کئی دن سے!"
تسنیم مسکرائی،
"اتفاق یا طے شدہ پروگرام؟"
وہ ایک مجروح کی طرح خاموش ہو گیا، تسنیم نے پوچھا،
"کہیے آپ شادی کب کر رہے ہیں؟"
"شادی؟"
"ہاں شادی! یہ سوال تو آپ نے ایسی بے بسی سے کیا ہے جیسے پھانسی کا کوئی
مجرم سولی کو پوچھتا ہے!"
"تسنیم تم آج خفا ہو کچھ؟"
"یہ باتیں پھر ہو لی رہیں گی، بتائیے!"
"کیا بتاؤں؟"
"شادی کب کر رہے ہیں آپ؟"
"میں خود اس مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں تم سے!"
"میں گفتگو بالکل نہیں کرنا چاہتی، پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے!"
"بہت جلد، اور کب!"
"پھر وہی مبہم بات ——— دن، تاریخ اور وقت بتائیے!"
انور نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ تسنیم نے کہا،

میں خوب سمجھتی ہوں، آپ اپنے قول سے پھر رہے ہیں، بھاگنے کا راستہ ڈھونڈھ رہے ہیں!"

"یہ غلط ہے!"

"میں جھوٹ نہیں کہتی، آپ باتوں میں ٹال اڑا دینا چاہتے ہیں!"

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"شادی!"

"تیار ہو تم؟"

"بالکل اپنی شرائط کے ساتھ جو آپ کو معلوم ہیں!"

"وہ شرائط مجھے تسلیم ہیں لیکن کچھ رکاوٹیں راستہ میں حائل ہیں، پہلے انھیں دور کر لوں"

"رکاوٹیں؟ آپ کے راستہ میں؟ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

"ہاں تسنیم یہی بات ہے، کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں!"

"تو ذرا میں بھی سنوں!"

"والد مخالف ہیں اس رشتہ کے!"

"والد مخالف ہیں؟ آپ تو کہہ رہے تھے، چٹکی بجاتے میں انھیں راضی کر لوں گا؟"

"ہاں میں نے یہ کہا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئے!"

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کچھ بھی نہیں ہے، شادی ہوگی اور ڈنکے کی چوٹ ہوگی!"

"لیکن کب؟"

"میں پھر والد سے گفتگو کرنے والا ہوں اس مسئلہ پر!"

"واہ، آپ تو لڑکی بن گئے، شادی آپ کی ہو رہی ہے یا آپ کے والد کی؟"

"میری!"

"پھر ان کی اجازت کیوں ضروری ہے؟ —— جائیداد کے لیے؟"

"ہاں!"

"آپ دولت کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں؟

"ہرگز نہیں!"

"کسی بات پر تو قائم رہیے

"میں جائیداد کھونا نہیں، اس لیے کہ وہ تمہارے اور زرینہ کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں!"

"شکریہ اس نوازش کا، لیکن مجھے اور زرینہ کو آپ کی جائیداد کی ضرورت نہیں، مجھے تو آپ کی ضرورت ہے، روپیہ اللہ کا دیا میرے پاس ضرورت سے بہت زیادہ ہے، اب بتائیے آپ کیا کہتے ہیں؟"

"جو تم کہہ رہی ہو!"

"ایک بات میں آپ کو بتائے دیتی ہوں، اگر آپ نے یہ سوچ بچار کا سلسلہ جاری رکھا تو میں اپنے وعدہ سے پھر جاؤں گی!"

"یعنی؟"

"پھر آپ لاکھ سر پٹکیں، میں شادی نہیں کروں گی آپ سے"

"تسنیم یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

جو کچھ کہہ رہی ہوں، سوچ سمجھ کے کہہ رہی ہوں۔

"مجھے کچھ مہلت دو!"

"میں بالکل مہلت نہیں دے سکتی! اگر مرد ہوتی، اور میری محبوبہ اپنے والدین کے ڈر سے ہجر مجبور کرتی اور مہلت مانگتی تو شوق سے جتنی وہ مہلت مانگتی دے دیتی، لیکن آپ کو نہیں دے سکتی!"

"کس لیے؟"

آپ مرد ہیں، جوان ہیں، عاقل و بالغ ہیں، آزاد و خود مختار ہیں، جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں، پھر آپ کو مہلت کیوں دوں بتائیے؟"

انور خاموش رہا تسنیم نے برہمی کے لہجہ میں کہا

"آپ برے کام اپنی مرضی سے بغیر اپنے والد سے پوچھے گچھے کر سکتے ہیں لیکن نیک کام میں آپ ان کے محتاج ہیں، فاحشہ اور آبرو باختہ عورتوں کے گھر جاتے وقت آپ نے کبھی اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف نہیں دیکھا لیکن ایک آبرو باختہ کو نیک اور پاک بنانے کے لیے آپ کو اجازت درکار ہے؟ کیوں صاحب؟"

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو کیا ہرج ہے؟"

"لیکن وہ خوش اسلوبی سے نہیں طے ہو سکتے، میں جانتی ہوں!"

"کس طرح؟"

کوئی بوڑھا باپ اپنے اکلوتے اور جوان لڑکے کو ایک ایکٹرس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا!"

"کہتے تو یہی ہیں!"

"انھیں کہنا بھی یہی چاہیئے، یہ کام اگر آپ کو کرنا ہے تو صرف اپنی ذمہ داری پر کیجئے. والد محترم سے کسی امداد کی امید نہ رکھیے!"

"ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا!

"لیکن کب؟ ———— میں دیکھتی ہوں اب اس غم سے نڈھال ہوئے جاتے ہیں!

"تمہارا خیال درست ہے!"

لیکن یہ غم میرا نہیں ہے. دولت کا ہے، دولت کے چھٹنے کا میں آپ کے ہاتھ آرہی ہوں، مگر دولت کے لیے آپ مجھے چھوڑے دے رہے ہیں!"

"یہ غلط ہے، دولت قارون بھی ہو تو تمہارے لیے چھوڑ دوں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو تسنیم"

"اگر یہ بات ہے تو اب انتظار نہ کیجیئے، ادھر یا ادھر فیصلہ کر ڈالیئے!"

انور نے ایک عزم کے ساتھ کہا،

"کر لیا فیصلہ!"

تسنیم نے پوچھا،

"کیا فیصلہ کیا آپ نے؟"

"میں جائیداد کو، والد کو، خاندان کو، سب کو چھوڑ دوں گا اور تم سے شادی کروں گا!"

تسنیم نے جان لیوا اداؤں کی بارش کرتے ہوئے پوچھا،

"سچ؟"

"بالکل سچ!"

"تو کب؟"

"جب تم کہو ——— اگر تم تیار رہو تو اسی وقت ابھی!"

وہ مسکرائی،

"آپ بڑے جذباتی ہیں، میں نے چھیڑا، آپ بھڑک گئے، میں آپ کی دشمن نہیں ہوں آپ والد کی دشمنی مول نہ لیجیے، انھیں راضی کرلیجیے، آپ ان کے اکلوتے اور چہیتے بیٹے بیٹے ہیں، آخر کار انھیں راضی ہونا ہی پڑے گا، جہاں اتنے دن انتظار میں گذرے، کچھ روز اور سہی، نہ آپ بوڑھے ہوئے جاتے ہیں، نہ میں!"

"عجیب چیز ہو تم بھی!"

وہ مسکرائی،

"کیوں؟"

اس نے تیکھے پن کے ساتھ کہا،

"یہی باتیں ابھی میں کہہ رہا تھا تو تم بگڑ گئیں، اور جھنجھوڑ ڈالا مجھے پکڑ کے، وہی باتیں تم کہہ رہی ہو تو کچھ نہیں، اب میں تمھاری باتیں ماننے سے انکار کرتا ہوں!"

"یعنی؟"

شادی ہوگی، اور فوراً ہوگی!"

"ہرگز نہیں ہو سکتی!"

"کیوں؟"

"میں ایک بوڑھی جان کا خونِ ناحق اپنی گردن پر نہیں لے سکتی! میں اپنے دل کے ساتھ کے لیے آپ کو کندۂ جہنم نہیں بنا سکتی!"

"میں خودکشی کرلوں گا تسنیم تم بہت پریشان کرنے لگی ہو مجھے!"

تسنیم نے بڑی ترشی، اور ملاطفت کے ساتھ کہا،

"میں آپ کی دشمن نہیں ہوں، دوست ہوں"

"مانتا ہوں!"

"جذبات میں آکر بھڑکیے نہیں عقل سے کام لیجیے!"

"یعنی شادی نہ کروں تم سے؟"

"کون منع کرتا ہے، لیکن کچھ روز انتظار سہی!"

"میرے لیے ایک پل ایک برس ہو رہا ہے!"

"یہی حالت میری بھی ہے!"

"اچھا یہ بتاؤ ایک بات نہیں ہو سکتی؟"

"کون سی بات؟"

"یہ کہ ہم شادی کر لیں اور کسی کو پتہ نہ چلے؟"

"یعنی چپ چپاتے؟"

"ہاں!"

"ایسا نہیں ہو سکتا!"

"آخر کیوں؟"

چپ چپاتے اگر میل جول رکھنا ہو تو شادی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ شادی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعلان ہو، دنیا جان لے کہ دو ہستیاں ایک ہو گئیں، مل گئیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی بن گئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!"

"مجھے تمھاری رائے سے بالکل اتفاق ہے لیکن اعلان بعد میں ہوتا رہے گا!"

"اس سے کیا فائدہ؟ پھر شادی ہی بعد میں کیوں نہ ہو؟ میں کہیں بھاگی تو نہیں

چاہتی ہوں؛ نہ آپ کی طرح کمزور ارادہ کی ہوں کہ صبح کچھ رائے اور دوپہر کو کچھ، اور شام کو کچھ اور!"

انور مسکرایا، اس نے کہا،

"عجیب ہستی سے پالا پڑا ہے،

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر!"

نسیم نے شگفتہ روئی کے ساتھ کہا

"مجھے کوئی شعر یاد ہوتا تو میں بھی شعر میں جواب دیتی لیکن مجبور ہوں"

"تمھیں مجبور کون کہہ سکتا ہے تمھیں تو لوگوں کو مجبور بنانے میں مزا آتا ہے!"

اتنے میں چائے بن کر آگئی نسیم نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی، ایک پیالی خود لی، دوسری انور کی طرف بڑھا دی بولی،

"آپ تھیٹر نہیں دیکھتے؟"

"بالکل نہیں!"

"کیوں؟ بدمذاقی کی کوئی حد بھی ہے؟

"یہ بدذوقی نہیں صحیح ذوق ہے!"

"یہ کیسے؟"

"تھیٹر کی اداکاری پر تصنع غالب ہوتا ہے، تماشائی بیٹھتے ہی اندازہ کر لیتا ہے کہ یہ ایک جھوٹا کھیل ہے سین سینری مصنوعی، اداکاری مصنوعی، صاف معلوم ہوتا ہے ہیروئن کہاں چھپی ہوئی ہے اور ہیرو پردہ کے پیچھے کیا کر رہا ہے؛ جو کر کب آئے گا،

اور اپنی مہمل اداکاری سے حاضرین کو ہنسانے کے بجائے، رلانے کا فرض کیب انجام دے گا، کوئی اداکار اگر اپنا مکالمہ بھول جائے تو داہنے بائیں رجسٹر لیے قاری صاحب کھڑے رہتے ہیں جو فوراً لقمہ دیتے ہیں، کم از کم اگلی صف کے تماشائی تو انھیں کھڑا ہوا بھی دیکھ لیتے ہیں اور اُن کی آواز بھی سن لیتے ہیں، سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تھیٹر میں پرخطر اور اثر انگیز مناظر دکھائے ہی نہیں جا سکتے، دریا کی روانی، بادل کی گھڑگھڑاہٹ، گاڑی کی سواری، ریل کا حادثہ، باغ و چمن کی بہار، ان میں سے کوئی چیز بھی اسٹیج پر نہیں دکھائی جا سکتی، پردہ اٹھتا ہے اور گرتا ہے، سیٹ نظر کے سامنے بدلے جاتے ہیں، ان سب باتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تماشائی کو ہر ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہے غلط، لیکن حاضرین کو احمق سمجھ کر صحیح باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے برعکس فلم میں مکمل ترین اور مبنی بر حقیقت زندگی کی تصویر دکھائی جا سکتی ہے کہیں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ جعلسازی ہے، حقیقی مناظر ہوتے ہیں، سچے حادثات ہوتے ہیں، قرین قیاس واقعات ہوتے ہیں، جو کچھ ہوتا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ ہے، حقیقت ہے سچائی ہے، لہذا میں تھیٹر سے نفرت کرتا ہوں اور فلم کا دیوانہ ہوں، تمھاری فلم میں نے نہ دیکھی ہو گی تو دس بار تو دیکھی ہو گی، جب دیکھا ہے ایک نیا لطف پایا ہے، تھیٹر کو ایک بار دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، وقت کاٹے نہیں کٹتا، اور پھر یہ تھیٹر کے مسخرے لاحول ولا قوۃ، میرا بس چلے تو گولی مار دوں، مجھے تو انھیں دیکھ کر ہنسی نہیں آتی غصہ آتا ہے۔"

تسنیم بڑے غور سے انور کی باتیں سنتی رہی، پھر اس نے کہا،

"اس لیے آپ تھیٹر نہیں دیکھتے؟"

"ہاں اور کیا!"

"ہم کہیں تو"

"تم کہو، تو تھیٹر کیا جہنم میں جانے کو تیار ہوں!"

تسنیم نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا،

بات تو آپ نے ٹھیک کہی، واقعی تھیٹر میں اداکاری کا وہ عروج کہاں، جو فلم میں نظر آتا ہے لیکن میری خاطر سے، کم از کم ایک بار آپ کو ضرور دیکھنا پڑے گا!"

دیکھ لوں گا! ——— کل ہی آ جاؤں گا!"

"کل نہیں"

"پھر؟"

"جب میں کہوں! جب میں دعوت دوں!"

"آپ کی دعوت بدولت ضرور منظور کریں گے!"

تسنیم نے کھڑے ہو کر کہا،

"آداب بجالاتی ہے یہ کنیز!"

کچھ ایسے انداز سے کہ انور بے ساختہ ہنس پڑا،

باب ۳۲

مرد کی غیرت

تسنیم کیبن میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی، اپنا "میک اپ" جانچ رہی تھی، نئی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی، سب اداکار سیٹ پر پہنچ چکے تھے، صرف اسی کی کسر تھی۔ وہ جلدی جلدی میک اپ کی خامیاں درست کر رہی تھی کہ دلاری تیزی اور شوخی کی تصویر بنی دھم دھم کرتی آن موجود ہوئی، وہ آئینہ کے سامنے آکھڑی ہوئی، تسنیم نے کہا،

"ہٹو سامنے سے!"

وہ بولی،

"نہیں ہٹتے"

"اونھ بہت بے موقع مذاق کرتی ہو۔ دیر ہو رہی ہے، سیٹ پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا!"

وہ اٹھلا کے بولی،

"تمہارے بغیر کون سے کام رکے ہوئے ہیں، اتنی غلط فہمی بھی اچھی نہیں ہوتی"

تسنیم نے آہستہ سے اسے دھکا دیا۔

"ہٹتی ہو سامنے سے یا نہیں؟"

"کہہ تو دیا نہیں!"

یہ کہتے کہتے دُلاری نے تسنیم کا میک اپ خراب کر دیا، اُس نے بگڑ کر کہا،

"یہ ادائیں انہی کو دکھایا کرو، وہ جو ہیں تمھارے ڈائرکٹر صاحب، یہاں یہ جادو نہیں چلنے کا!"

دُلاری ذرا شرما گئی، اُس نے کہا،

"کہہ لو جو جی چاہے، ایک ایک بات تمھاری نہ کہہ دوں ڈائرکٹر صاحب سے جب کہنا!"

"تو کیا بگاڑ لے گی میرا؟ میں تیرے ڈائرکٹر صاحب کو اپنی جوتی کی خاک بھی نہیں سمجھتی!"

"یہ بھی کہوں گی!"

"جو تیرا جی چاہے کہہ دے جاکر، لیکن سامنے سے تو ہٹ!"

"ان سے کہوں گی یہ تسنیم جلتی ہے ہم سے!"

"میں کیوں جلنے لگی؟"

"پھر ڈائرکٹر صاحب کے ذکر کے ساتھ رال کیوں ٹپک رہی تھی؟"

"میری یا تیری؟"

"میری کم تیری زیادہ!"

دونوں ہنسنے لگیں،

اب نیلم اور شبنم وغیرہ بھی آگئیں، تسنیم کا کیبن مرکز تھا وقت گزاری کے لیے تمام ایکٹرسوں کا، اس مجمع کو دیکھ کر بولی،

"خیر تو ہے، تم سب نے یہاں کیوں دھاوا بول دیا اس وقت؟"

نیلم نے کہا،

"آج چھٹی منائیں یہاں!"

شبنم بولی،

ہاں جی، ہر وقت کام، کام، کام، بھاڑ میں جائے ایسا کام!"

دلاری نے کہا،

یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، اتنی دیر سے، مگر یہ بی تسنیم اڑی ہوئی ہیں اپنی ضد پر کہ ہم تو جائیں گے اسٹڈیو میں ڈائرکٹر صاحب بھڑک رہے ہوں گے ہمارے انتظار میں"

نیلم بولی،

"جانے دو بیچاری کو کیوں روکتی ہو؟"

"شبنم نے کہا

"ہاں دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے!"

دلاری نے شرارت بھرے لہجہ میں پوچھا،

"کیوں؟ کیسے؟"

شبنم نے کہا،

اس وقت ڈائرکٹر صاحب بالکل اکیلے ہیں، چیونٹی اور مچھر تک نہیں ہے وہاں، یہی تو وقت ہے جانے کا!

دلاری آئینہ کے سامنے سے ہٹ آئی، اس نے مصنوعی افسردگی اپنے اوپر طاری کر کے کہا،

"جاؤ!"

نیلم :-

" لیکن خوب بن ٹھن کے جانا"

شبنم :-

" مجھ سے آنکھیں نہ چار کرنا، ورنہ میری نظر لگ جائے گی "

دلاری :-

" واہ ری خود ہی بنی جاتی ہے، ڈائرکٹر صاحب، لو اور سنو، اس حوصلہ کو دیکھئے اور اور اس کو دیکھئے !"

سب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، ایک نئی ایکسٹرا ایکٹرس ستارہ بھی موجود تھی، اُس نے تسنیم سے کہا،

" یہ تو چھیڑ رہی ہیں آپ کو، آج شوٹنگ ہی نہیں ٹالا پڑا ہے اسٹڈیو میں !"

" کیوں ؟ نوٹس بورڈ پر تو آج ہم سب کو بلایا تھا

ستارہ نے کہا،

" ہاں بلایا تو تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ آج ہی اتنا بڑا اور قیمتی کیمرہ ٹوٹ جائے گا جھن سے !

" ارے یہ کیا ہوا ؟"

" ٹوٹ گیا بیچارہ !"

شبنم بولی،

" کسی کے دل کی طرح !"

نیلم نے لقمہ دیا،

" کبھی کیا، صاف صاف کہو کس کے دل کی طرح ؟"

دلاری بولی،

"صاف صاف کہنے میں خطرہ ہے!"

"خطرہ کیسا؟"

"خفا ہو جائیں گی!"

"کون؟"

اس نے تسنیم کی طرف اشارہ کر کے نیلم سے بڑے رازدارانہ انداز میں چپکے سے کہا

"خبردار چپ!"

تسنیم نے دلاری کے ایک چٹکی لی زور سے

"یوں نہیں مانے تو لے!"

دلاری بلبلا گئی،

"مدد! مدد!"

"چیختی ہوں مدد کے لیے بڑے زور سے، نہیں تو چھوڑ دو!"

تسنیم نے چھوڑ دیا، سب مل جل کے بیٹھ گئیں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے شور میں

اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں،

دلاری نے ستارہ سے کہا،

"وہ تو کہو آج شوٹنگ ہی نہیں ہوئی۔ اگر ہوتی، تب؟ —— اتنی دیر کہاں

کر دی تم نے آج؟"

ستارہ نے جواب دیا،

آج ایسا واقعہ میرے پڑوس میں ہو گیا کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے

ہوتے ہیں!"

"خیریت؛ کیا ہوا؟"

"قتل!"

سب کے منہ سے چیخ نکلی

"قتل!"

ستارہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

"ہاں! بڑا ہولناک!"

"کیسے؟ کس کا؟"

"ایک نوجوان عورت کا!"

نسیم نے پوچھا،

"کس جرم میں؟"

ستارہ نے کہا،

"مرد کی غیرت کے افسانے سنتی آئی تھی، آج آنکھوں سے دیکھ لیا"

"اوہ پورا واقعہ بتاؤ کیا ہوا؟"

ہمارے پڑوس میں ایک رہتے تھے، بڑے آوارہ اور بدمعاش، شادی کر کے جورو لائے، مگر اس سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی، وہ بھی ذرا من چلی، اُس نے ایک پڑوسی سے آنکھ لڑائی اور چپکے چپکے تعلقات قائم ہو گئے دونوں میں"

"پھر کیا ہوا؟" شبنم نے

"پھر یہ ہوا!" ستارہ نے جواب دیا،

کہ ایک دن شوہر نے اپنی جورو، اور اس کے یار کو، دیکھ لیا، وہ حضرت تو بھاگ کھڑے ہوئے، یہ کھڑی رہ گئی سامنے، بس پھر کیا تھا، شوہر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چاقو کا ایک بھرپور ہاتھ جو سینہ پر مارا ہے، تو بیچاری لوٹن کبوتر بن گئی، مرغی کی طرح ذرا کے ذرا پھڑپھڑائی ایڑیاں رگڑیں اور ختم ہو گئی!"

یہ داستان سن کر سناٹا چھا گیا، سب پر، دم بخود بیٹھی تھیں یہ سب ستارہ نے پھر کہا،

"مرد چاہے جیسا آوارہ بدمعاش ہو لیکن اس میں غیرت ضرور ہوتی ہے!"

تسنیم خاموش بیٹھی اب تک ستارہ کی باتیں سن رہی تھی، اب اس سے ضبط نہ ہو سکا اس نے کہا،

"تم اسے غیرت کہتی ہو؟ اور اسے خیانت کی انتہا سمجھتی ہوں!"

ستارہ حیرت سے تسنیم کی طرف دیکھنے لگی،

شبنم نے کہا،

"اور کیا!"

تسنیم جل کر بولی،

"مرد کھلے بندوں آوارگی کرے تو اسے ذرا بھی غیرت نہیں آتی، اور عورت اگر چھپ کر گناہ کرے تو اس قابل ہے کہ اس کے سینے میں چاقو بھونک دیا جائے، یہ ہے انصاف مرد کا!"

ستارہ نے کہا،

"ہم جیسے ہیں، سب جانتے ہیں، لیکن اگر کسی سے شادی کر لیں تو نباہیں ضرور اور نہ نباہیں، تو ہمیں چاقو سے نہیں بندوق سے مار دیا جائے مگر اف نہ کریں گے!"

"تمھاری جیسی بے وقوف عورتوں نے مرد کو بگاڑا ہے ——— میں پوچھتی ہوں شوہر کو اگر آوارگی کا حق ہے تو بیوی اس نعمت سے کیوں محروم کی جائے؟"

"بڑی نعمت!" شبنم نے طنز کیا،

"ہاں نعمت!" تسنیم نے جواب دیا،

"مرد آوارگی اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہے، اور عورت کے گلے میں اُس نے عصمت و عفت اور پاک دامانی کا طوق ڈال رکھا ہے ——— کچھ نہیں، یہ سب شرارت اور خباثت کی باتیں ہیں، ایک نیک مرد کی بیوی اگر آوارگی سے تو وہ ہر سزا کی مستحق ہے لیکن ایک بدمعاش شوہر کی بیوی اگر آوارگی پر اُتر آئے تو اس پر کس اصول سے اعتراض کیا جا سکتا ہے؟"

شبنم نے مسکراتے ہوئے کہا،

"کیا کہہ رہی ہو، کچھ سوچا بھی؟"

"غلط ہو تو ٹوک دو!"

غلط تو ہی ہے ——— میں کہتی ہوں دنیا میں نیک مرد کتنے ہیں؟ ہوں گے تھوڑے سے، باقی یہ مردوں کی فوج جو نظر آتی ہے، یہ بدمعاش ہی تو ہیں، اگر ان کی بیویوں نے آوارگی اور بدچلنی کی نعمت سے فائدہ اٹھانا شروع کیا تو ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ پھر ہمیں کون پوچھے گا؟"

نیلم کھی کھی کر کے ہنسنے لگی، بولی،

اطمینان رکھو، تمھاری گرم بازاری میں فرق نہیں آ سکتا، پہلے کوئی تمھارا ایسا بن تو لے!"

دلاری بولی،
"ہاں اور کیا، بن ڈوبے کوئی تمھارا ایسا پھلے!"
"مجھے بے موقع باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں، ذکر ہو رہا تھا کچھ اور باتیں چھڑ گئیں کچھ اور!"
دلاری بولی،
"جو عورتیں مظلوم ہوں گی، ہم تو نہیں ہیں، یہاں تو اُٹھتے گھونسہ، بیٹھتے لات والا معاملہ ہے کسی مرد کی ہمت ہے کہ گردن اونچی کرکے ہمارے نعمت خانہ میں داخل ہو یہاں جو مرد آتا ہے، اس کو اپنی اکڑی ہوئی گردن جھکانی پڑتی ہے"
تسنیم نے پوچھا،
"ڈائرکٹر صاحب کو بھی؟"
دلاری بیباکی سے بولی،
"سب کو!"
"اوہو، کتنوں کو پھانس رکھا ہے تو نے؟ ذرا فہرست تو سنا!"
"ایک تو تم ہی ہو!"
تسنیم نے پھر مداخلت کی،
"عورت کے دکھ کا علاج پیشہ کرنا اور کمانا نہیں ہے؟"
نیلم نے پوچھا،
"پھر کیا ہے؟"
شبنم نے لقمہ دیا،

"خودکشی!"

دلاری ہنسنے لگی، ستارہ نے کہا،

"ہٹو بھی، تمھیں ہنسی آرہی ہے، یہاں دل کے ٹکڑے اڑے جارہے ہیں!"

تسنیم نے کہا،

"لیکن مرد تو یہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے سینہ میں دل ہی نہیں ہوتا —— اسی لیے تو وہ خود گلچھرے اڑاتے ہیں، اور عورت؟ کھانا پکاتی ہے، کپڑے سیتی ہے جھاڑو دیتی ہے، بچے پیدا کرتی ہے!"

"تو اور کیا کرے۔ پگڑی باندھ کر پہرہ دینا شروع کردے، سونے والو جاگتے رہیو!"

نیلم زور سے ہنس پڑی، اس نے تسنیم کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا، زیادہ نہ سوچا کرو، ورنہ دماغ خراب ہوجائے گا، بس صرف ایک بات یاد رکھو، ہر غم دور ہوجائے گا، ؎

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

ہم تو ہنسیں گے، تمھیں نہیں آتی ہنسی تو رو لو جتنا تمھارا جی چاہے!

شبنم بھی ایک ہی رونی ہے، خوب ساتھ دے گی تمھارا!"

تسنیم نے زہر خند کے ساتھ کہا

"کیوں نہیں، شبنم جو ٹھہری —— قدرت کا آنسو، عورت کی مظلومیت پر!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹہلتے ہوئے، خراماں خراماں، ڈائرکٹر صاحب تشریف لائے، بغیر کسی وجہ کے مسکرائے، حاضرین پر ایک نظر ڈالی، دلاری کو دیکھ کر پھر مسکرائے،

اور فرمایا،

"کیا ہو رہا ہے"

تسنیم نے کہا،

"بڑی عمر ہے آپ کی"

"کیسے جانا آپ نے؟"

"ابھی آپ ہی کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا!"

"کس سلسلہ میں؟"

تسنیم نے کہا،

"یہ دلاری سے پوچھیے!"

وہ جھینپ گئے، انھوں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا،

آپ ہی بتا دیجئے!"

"نا صاحب ہم نہیں بتاتے، یہ ٹھہری ایک لڑاکا، پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ جائے گی۔!"

ڈائرکٹر صاحب نے کہا،

"میں یہ عرض کرنے آیا تھا، کہ کیمرہ ٹھیک ہو گیا، سیٹ تیار ہے، لہذا اسٹوڈیو

تشریف لے چلیے۔

شبنم نے دلاری سے کہا

"جاؤ دلاری"

ڈائرکٹر صاحب نے سنی کی ان سنی کر دی، اور واپس چلے، انھوں نے بیٹھ موڑی

تھی کہ شبنم کی آواز کان میں آئی جو دلاری سے کہہ رہی تھی،

"اری جا جلدی سے دیر ہو رہی ہے انھیں بے چاروں کو!"

ڈائرکٹر صاحب چلے گئے، ستارہ، دلاری، شبنم، نیلم بھی ایک ایک کر کے چلی گئیں، اور تسنیم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا میک اپ جانچنے لگی، اس وقت اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، اور معلوم ہوتا تھا، بہت پریشان اور مغموم ہے!

باب ۳۳

"اگر پسر نہ تواند پدر تمام کند"

انور آج پھر قاسم سیٹھ کے کنج تنہائی میں پہنچا، وہ عالم خیال میں تسنیم سے اپنی شادی کا پروگرام مرتب کر رہے تھے، بیٹے کی یہ مداخلت بے جا ناپسند ہوئی بے رخی اور سرد مہری کے ساتھ فرمایا،

"کیا ہے؟"

"کچھ ضروری باتیں عرض کرنی ہیں" انور نے کہا،

"شادی کے بارے میں کہو گے کچھ؟"

"جی ہاں! اسی مسئلہ پر ——"

"تم اپنے فیصلہ پر قائم ہو نا؟"

"جی نہیں!"

وہ چونک پڑے، پھر کر بولے،

"کیا کہا؟"

"میرا وہ فیصلہ وقتی تھا، میں اس کی پابندی نہیں کر سکتا!"

"یعنی تم ایکٹرس سے شادی کرو گے؟"

"میرا آخری فیصلہ یہی ہے!"

"کیوں؟"

"میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں، میں اس کی معصوم اور ذہین بچّی کو اپنی لڑکی بنا چکا ہوں!"

یہ باتیں سن کر وہ اس طرح چونکے جیسے بھڑ نے کاٹ کھایا ہو،

"لڑکی؟"

"جی ہاں اس کی ایک لڑکی بھی ہے۔ اور میں اُسے اتنا ہی چاہتا ہوں، جتنا آپ مجھے چاہتے ہیں!"

وہ اُٹھ کر برہمی کے عالم میں ٹہلنے لگے

"یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا، میں ایک ولد الزنا اور نطفہ، ناتحقیق چھوکری کو اپنی پوتی نہیں بنا سکتا، اپنا وارث قرار نہیں دے سکتا"

وہ نہایت نرمی کے ساتھ بولا،

"تو میں اس کے لیے تیار ہوں کہ آپ کی جائداد سے دستبردار ہو جاؤں، یہ گھر بھی اگر حکم ہو تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا!"

"کسی طرح بھی نہیں!"

"جی نہیں، بالکل مجبور ہوں!"

"پھر سوچ لو!"

"سوچ چکا اچھی طرح!"

"ایک بار اور غور کر لو!"

"کئی بار غور کر چکا ہوں!"

"اگر میں نے کوئی فیصلہ کر لیا، تو وہ بھی اٹل ہوگا!"

"جانتا ہوں آپ کا فیصلہ بھی اٹل ہوتا ہے!"

"پھر بھی اپنی ضد پر قائم ہو؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں!"

سیٹھ صاحب ٹہلتے ٹہلتے کرسی پر آ کر بیٹھ گئے، انھوں نے اپنے نالائق اور ناخلف بیٹے سے کہا،

"تم نالائق ہو، ناخلف ہو!"

انور نے کوئی جواب نہیں دیا، سیٹھ صاحب نے پھر فرمایا،

"سن لو، کان کھول کے، اگر تم شادی کر سکتے ہو تو میں بھی کر سکتا ہوں، اگر چاہوں تو ایکٹرس کو بیاہ کر لا سکتا ہوں، اپنے گھر میں لا سکتا ہوں، اپنے گھر میں!"

یہ باتیں انور کو عجیب معلوم ہوئیں، وہ اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکا، اس نے کہا

"بیشک آپ کو کوئی منع نہیں کر سکتا!"

سیٹھ صاحب بولے،

"ہاں میں جانتا ہوں اتنی ہمت کسی میں نہیں ہے!——— اور تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے ایک ایکٹرس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"

انور نے جل کر کہا،

"مبارک"

سیٹھ صاحب نے جل کر کہا،

"لیکن میں تمہارے لیے یہ الفاظ نہیں استعمال کر سکتا۔ میں تمہیں بددعا دیتا ہوں کہ تمہاری زندگی کا یہ نیا دور نامبارک، منحوس، نامسعود ثابت ہو اور مجھے یقین ہے کہ ہو گا!"

"اللہ کی مرضی پر ہم سب سر جھکانے پر مجبور ہیں!"

"اللہ کی مرضی ——— بہت دنوں کے بعد، یہ نام میں نے تمہاری زبان سے سنا!"

"یہ نام مصیبت ہی میں زبان پر آتا ہے!"

"خود ساختہ مصیبت میں بھی؟"

"ہر مصیبت میں!"

سیٹھ صاحب پھر ٹہلنے لگے، انھوں نے الور کے پاس آکر کھڑے کہا،

"اگر میری جائیداد کا حشر یہ ہونا ہے کہ بالآخر اس کی مالک کوئی ایکٹرس بنے تو یہ تمہارے ذریعہ کیوں ہو؟ میرے ذریعہ کیوں نہ ہو؟ ——— خود میں کیوں نہ کسی مہ جبیں ایکٹرس کو سونپ دوں اسے؟"

"آپ یہ کر سکتے ہیں!"

"مجھے آپ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، میں یہ کر گئے ہوں گا ——— اب تک میرا ارادہ تھا کہ نصف جائیداد تمھیں دوں گا، نصف تمہاری نئی ماں کو، لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ساری جائداد کا وارث انجمن کو بنا دوں تاکہ تم میرے مرنے کے بعد بھی یہ گلچھرے نہ اڑا سکو، کوئی ایکٹرس میری جائیداد کے لیے تمھیں نہ پھانس سکے!"

میں آپ کے اس فیصلہ کو تسلیم کرتا ہوں، مجھے ذرا بھی عذر نہیں ہے، اس کے ماننے میں!"

"بہت خوب ــــــ تو اب تم اپنی ایکٹرس سے شادی کر سکتے ہو، لیکن یاد رہے شادی کے بعد، اس گھر کے دروازے تم پر، تمہاری بیوی پر، تمہاری مفت کی لڑکی پر بند ہو جائیں گے!"

"یہ تو آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں!"

"شاباش، میں تمہارے استقلال سے بہت خوش ہوا، آج ہی جاؤ اور شادی کر لو، ایسی سعادت مند اولاد صرف مجھ جیسے خوش قسمت باپوں کے حصہ میں آتی ہے، جو ایک عورت کے لیے باپ کو چھوڑ دے، جزاک اللہ،

ع ــ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

انور نے ان تیکھی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا،

"اب میں اجازت چاہتا ہوں"

"جا سکتے ہو!"

"لیکن مجھے اس کی اجازت تو ہے کہ کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں؟"

"ہاں، تم جب چاہو آ سکتے ہو، لیکن بے غرض بن کر آنا"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

مطلب صاف ہے، روپیہ نہ تم مانگنا، نہ میں دوں گا!"

انور کو یہ باتیں بری لگیں، اس نے کہا،

"آپ مجھے اتنا ذلیل کیوں سمجھتے ہیں؟ میں ہرگز آپ سے روپیہ نہیں مانگوں گا، کبھی

نہیں مانگوں گا!"

"اس نوازش کا میں شکر گزار ہوں ——— لیکن آپ روپیہ طلب بھی کیوں کریں گے خدا کا دیا آپ کے پاس کیا کم ہے؟ ماں کی جائیداد آخر کس کام آئے گی!"

"اگر آپ فرمائیں تو میں اس سے بھی دستبردار ہو سکتا ہوں؟"

"اتنا زیادہ ایثار نہ فرمائیے، جس حد تک میں نے گزارش کی ہے بس اسی حد تک قائم رہیئے!"

تسنیم بڑی دیر کی آئی ہوئی تھی، اور بغلی کمرہ میں اطمینان سے بیٹھی باپ بیٹے کی باتیں سن رہی تھی، جیسے ہی انور نے باہر قدم رکھا، وہ کمرہ میں آگئی، اُسے دیکھتے ہی سیٹھ صاحب چونک پڑے،

"ارے تم؟"

"جی یہ لونڈی حاضر ہے!"

"کب آئیں؟"

"بڑی دیر ہوئی!"

"کہاں تھیں؟"

"پاس کے کمرہ میں!"

"یہاں کیوں نہ آگئیں؟"

"وہیں ٹھیک تھا، اطمینان سے باتیں سن رہی تھی آپ دونوں کی!"

سیٹھ صاحب مسکرائے

"ساری باتیں سن لیں تم نے؟"

"جی ——— لیکن آپ بڑے ظالم ہیں، سچ!"

"یہ کیسے جانا تم نے؟"

"آخر آپ شادی کی اجازت کیوں نہیں دے دیتے بیچارے کو؟"

"بے چارہ؟ انور کو تم بیچارہ کہتی ہو؟"

"صورت سے تو بڑے بھولے معلوم ہوتے ہیں!"

شیطان ہے شیطان!"

"ہوں گے!"

"تم نہیں جانتیں؟ یہ کتنی لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی تباہ کر چکا ہے، تسنیم نے حیرت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے کہا۔

"سچ کہیئے!"

"باپ اپنی اکلوتی اولاد کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا!"

"آپ کہتے ہیں، تو سچ ہو گا، لیکن میرا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا!"

"تم مجبور ہو۔ اس کی صورت ایسی ہی نظر فریب ہے۔ نہ معلوم کتنوں کو دھوکا دے چکا ہے، یہ نالائق!"

"صورت تو بالکل آپ ہی سے ملتی ہوئی ہے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس نے میری ایک عادت بھی نہیں لی ہے، بدمعاش کہیں کا ——— میں نے تمہارے سوا کسی عورت سے محبت نہیں کی، اور یہ میرا بیٹا درجنوں عورتوں کو محبت کے دام میں پھنسا کر خراب کر چکا ہے! ——— میں نے تو سنا ہے کالج کی طالب علمی کے زمانہ

میں بھی دیہات کی شریف اور نیک لڑکیوں کو خراب کرتا رہا ہے، یہ میری اولاد نہیں، شیطان کی اولاد ہے!"

"یقیناً!" تسنیم نے مسکرا کر کہا،

وہ اس طرح محوِ حیرت بنی یہ داستان سن رہی تھی، جیسے کوئی بچہ بہرام چور کی کہانی سُن رہا ہو، پھر بولی،

"آپ نے تربیت نہیں کی!"

"ارے بہت کی لیکن بد فطرت ہے لاکھ تربیت کرو، کتے کی دم کی طرح ٹیڑھا ہی رہے گا!"

"یہ تو پچھلی باتیں ہیں، اب تو معلوم ہوتا ہے، واقعی محبت ہے انھیں کسی سے سچی محبت!"

"یہ کیسے سمجھیں تم!"

"یوں سمجھی کہ اگر کھوٹی محبت ہوتی، تو باپ کی اتنی بڑی جائیداد سے منہ نہ موڑ لیتے

"تسنیم تم نہیں جانتیں، بڑا فیلسوف ہے یہ لونڈا، اسے یقین ہے، میں ایسا نہیں کروں گا، کوئی باپ بھی نالائق سے نالائق ——— اولاد کو ——— وہ بھی اکلوتی ——— بالکل محروم نہیں کر سکتا!"

تسنیم مسکرائی،

"ہاں یہ دوسری بات ہے ——— باپ بیٹے، دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں!"

سیٹھ صاحب نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا،

"مجھ پر بھی چوٹ کر گئیں تم، بڑی شریر ہو بخدا!"

تسنیم نے سنجیدہ ہو کر کہا

"لیکن ایک بات تو بتایئے؟"

اور سیٹھ صاحب نے اسے آنکھوں آنکھوں میں حلق سے اتارتے ہوئے کہا،

"کہو، کہہ کے تو دیکھو!"

"یہ لڑکی کا کیا معاملہ تھا؟"

کچھ بھی نہیں، جس ایکٹرس سے صاحبزادے شادی رچانا چاہتے ہیں، وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہے، ہو گی اس کی کوئی لڑکی لیلیٰ پیاری ہے تو اس کی گلی کا کتا بھی پیارا ہے، وہ ایکٹرس پسند ہے تو اس کی چھوکری کو بھی لڑکی بنا لیا، بس یہ بات ہے اور کیا؟"

"نہیں میں کچھ اور پوچھ رہی تھی!"

"تو پوچھو نا!"

"میں یہ پوچھ رہی تھی، آپ کیوں جلتے ہیں، اس معصوم اور بے گناہ لڑکی سے؟" خطا ہے تو ایکٹرس کی، نہ کہ اس لڑکی کی؟"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن

تسنیم نے مچل کر کہا

"ہم لیکن ویکن نہیں جانتے، صاف صاف بتایئے!"

بتا تو رہا ہوں، سنو بھی تو!"

"کہیئے!"

"میں، ایک غیر لڑکی کو، کیوں اپنا وارث بنا لوں بھئی؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟"
تسنیم نے اور زیادہ سنجیدگی اپنے اوپر طاری کر کے کہا،
یہ بات تو پھر میری لڑکی پر بھی صادق آئے گی! ——— جو میری بچی کو تیکھی نظر سے دیکھے، زندگی بھر صورت نہ دیکھوں اس کی!"
سیٹھ صاحب نے دل گداز قہقہہ لگایا،
"خفا ہو گئیں، ہماری تسنیم بیگم ——— ارے بھئی کہاں گنگا تیلی اور کہاں راجہ بھوج کہاں تمہاری لڑکی، کہاں اس قحبہ کی لونڈیا، تم بھی عجیب چیز ہو!"
"سوچ لیجیے، جتنی محبت آپ مجھ سے کریں گے، اس سے زیادہ میری بچی سے کرنی ہوگی!"
"کروں گا بھئی ——— کیسے نہ کروں گا؟ مجھے لاولد سمجھ لو، انور کو عاق کر دیا، تمہاری بچی میرے دل کا ٹکڑا بن کر رہے گی اس گھر میں دیکھ لینا،"
"وہ مسکرا کر بولی،
"دیکھوں گی!"
سیٹھ صاحب نے موقع غنیمت سمجھ کر کہا،
"لیکن وہ مبارک دن کب آئے گا، جب تم دلہن بن کر اس گھر میں آؤ گی؟ یہ تو بتاؤ"
"آجائے گا کسی دن!"
"لیکن ہم سے یہ ہجر کے دن نہیں کاٹے جاتے اب!"
"بڑے لوگوں کا قول ہے، جو مزہ ہجر میں ہے وہ وصل میں نہیں!"
بڑے لوگ نہیں بے وقوف لوگ کہو، ایسی خوشنما لیکن کھوکھلی بات کوئی معمولی بیوقوف نہیں کہہ سکتا!"

تسنیم نے داد دیتے ہوئے کہا "مانتی ہوں آپ کی بات!"

"اگر یہ بات ہوتی، تو اب تک مسز قاسم بن کر آ چکی ہوتیں تم یہاں —— الفاظ کی رانی تم ہو، تم سے کوئی نہیں جیت سکتا —— دیکھ لو، کتنے دن ہو گئے، مگر بہلا رہی ہو، وعدہ کرتی ہو، مگر پورا نہیں کرتیں!"

"ہو جائے گا پورا!"

"آخر کب؟ جب میں مر جاؤں گا؟"

"خدا نہ کرے!"

"تو آج تاریخ مقرر کر کے اُٹھو!"

"جب تک میرا ناٹک نہیں مکمل ہو جاتا، میں کچھ نہیں کہہ سکتی!"

"تو کر ڈالو جلدی سے مکمل!"

"ہو رہا ہے، ہو جائے گا، زیادہ جلدی کروں گی تو لطف جاتا رہے گا!"

"مجھے تو ناٹک سے عشق ہے، میں تو دن گن رہا ہوں کہ کب تمہارا ڈرامہ اسٹیج پر کھیلا جائے گا، جس کی مصنف بھی تم ہو اور ڈائرکٹر بھی تم، سے دو آتشہ ہو گا ہو گا واللہ وہ ڈرامہ"

"یہ تو آپ دیکھ کر فیصلہ کیجیے گا کیا معلوم کیسا بنتا ہے!"

"دوسروں کی ڈائرکشن میں جب تم کمال کرتی ہو تو اپنی ڈائرکشن میں کیا قیامت نہ ڈھاؤ گی؟"

وہ ایک جمائی لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی

"اچھا اب زیادہ نہ بنائیے، میں جاتی ہوں!"

"ابھی سے؟"

"جی ہاں بہت دیر ہو گئی، یار زندہ صحبت باقی، پھر آؤں گی، آتی ہی رہتی ہوں، اتنی بے صبری بھی کیا؟"

"تم میری جگہ ہوتیں، تو یہی سوال میں تم سے کرتا!"

اتنے میں ریڈیو پر جگر کی ایک غزل گائی جانے لگی، تسنیم پھر بیٹھ گئی، سیٹھ صاحب نے اس عنایت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اس نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور بڑے انہماک سے غزل سننے لگی، سیٹھ صاحب کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی،

تسنیم کو شعر و شاعری کے موضوع سے دلچسپی تھی اور وہ اس وقت قیامت کی پھبن، اور سج دھج کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی، وہ نظارہ کر رہے تھے اس کا خاموشی کے ساتھ، زبان کا کام آنکھوں سے لے رہے تھے، وہ ہتھیلی پر تھوڑی رکھے غور سے غزل سن رہی تھی، اور سیٹھ صاحب، اس سامنے بیٹھی ہوئی مجسم غزل کو بڑے غور اور انہماک سے، عینک کے سہارے، پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے!

باب ۳۴

یاددہانی

تسنیم کو جگر کی غزل بہت پسند آئی تھی، وہ گھر پہنچی فوراً زرینہ کو اس کے کمرہ سے بلایا، وہ آئی اور لپٹ کر بیٹھ گئی، تسنیم نے محبت سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

"بیٹی! وہ میری الماری ہے نا؟"

"جی!"

"اس میں جگر صاحب کا دیوان "شعلۂ طور" رکھا ہے، ذرا لے تو آنا جھپک کے!"

زرینہ دوڑی دوڑی گئی، اور دیوان اٹھا لائی، تسنیم نے ورق گردانی کرتے کرتے وہ غزل ڈھونڈھ نکالی جو ابھی قاسم سیٹھ کے ہاں سن کر آئی تھی، غزل پر انگلی رکھ کر، اس نے کہا،

"یہ ہے!"

زرینہ ماں کا منہ دیکھنے لگی، تسنیم نے کہا،

"ذرا گاؤ تو غزل!"

دیوان تسنیم نے زرینہ کی طرف بڑھا دیا، پہلے اس نے ایک نظر غزل پر ڈالی پھر کہا،

اس کی دھن کیا ہوگی؟

تسنیم نے گا کر بتایا، زرینہ بڑی ذہین تھی اور نقل اتارنے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، فوراً اماں کے لب و لہجہ میں غزل سرائی شروع کر دی، غزل شاید زرینہ کو بھی پسند آئی وہ بھی لگا کر گا رہی تھی اور تسنیم بیچ بیچ میں اسے لقمے دے رہی تھی کہ انور آگیا، اُسے دیکھتے ہی وہ چپ ہوگئی، تسنیم نے کہا،

"چپ کیوں ہوگئی لڑکی؟"

"زرینہ بدستور خاموش رہی، تسنیم نے کہا،

"بول! چپ کیوں ہوگئی؟"

وہ آہستہ سے انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی،

"خفا ہوں گے!"

تسنیم نے حیرت سے انور کی طرف دیکھا اور کہا،

"کون خفا ہوں گے، یہ؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں گانا بُری بات ہے!"

انور مسکرانے لگا، تسنیم بھی مسکرا دی، اس نے کہا،

پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے وعدہ کر لیا، اب نہیں گاؤں گی!"

تسنیم خاموش ہوگئی، زرینہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی، اس کے جانے کے بعد اس نے

انور سے کہا،

"آپ زرینہ، میری بچی کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ وہ آرٹسٹ بنے!"

لیکن آپ یہ چاہنے والے ہوتے کون ہیں؟ میری لڑکی ہے، میں جس راستہ پر چاہوں اسے لگاؤں!"

"لڑکی تو بیشک تمھاری ہے، لیکن چلے گی میرے راستہ پر!"

"خدا نہ کرے!"

"میں اتنا بُرا ہوں تسنیم؟"

"بُرے کیوں ہوتے؟ لیکن آپ کا راستہ وہ ہے، جس پر ہم نہیں چل سکتے!"

"ہمت کی کمی ہے یا ارادہ کی؟"

"نیت کی! ——— ہم اس راستہ پر چلنا نہیں چاہتے، جس راستہ پر آپ چل رہے ہیں، ہمت کی اس میں ضرورت ہے!"

"یہ کیسے؟"

"شریف بن جانا بہت آسان ہے، آبرو باختہ بننا بہت مشکل ہے، ہم نے آسان راستہ چھوڑ کر مشکل راستہ اختیار کیا ہے!"

"بالکل نیا فلسفہ ہے لیکن ہے دلچسپ!"

آپ کے لیے دلچسپ ہے اور میرے لیے حاصلِ حیات! ——— ذرا ہم آبرو باختہ عورتوں کے دل گردے کو دیکھیے، کیسے کیسے جانوروں سے ہمیں صبح سے شام تک سابقہ پڑتا ہے!"

"جانوروں سے؟"

"جی جناب، شیر، چیتا، ہاتھی، بھیڑیا، سانپ، بچھو، کھنکھجورا، شہد کی مکھی، بھڑ، یہ سب جانور ہمارے ہاں آدمی کی صورت میں آتے ہیں، کوئی ہمیں زندہ چبا لیتا ہے، شیر کی طرح، کوئی ہمیں پھاڑ ڈالتا ہے چیتے کی طرح، کوئی ہمیں روند ڈالتا ہے ہاتھی کی طرح کوئی ہمیں بھنبھوڑ کھاتا ہے بھیڑیے کی مانند اور کوئی سانپ کی طرح ڈستا ہے، بچھو کی طرح ڈنک مارتا ہے کھنکھجورے کی طرح اپنے ہزاروں پاؤں ہمارے سینہ میں گاڑ کر چپک جاتا ہے، کوئی شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتا ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں، پھر ہمارا حوصلہ دیکھیے کہ ان سب جانوروں سے ہمیں ہنس ہنس کر ملنا پڑتا ہے، ان کا استقبال کرنا پڑتا ہے، ان کی خاطر مدارات کرتی ہے، ان کے پہلو میں راتیں بسر کرنی پڑتی ہیں، یہ مصیبتیں شریف عورتوں کے نصیب میں کہاں؟ ——"

انور نے تسنیم کی یہ باتیں غور سے سنیں اور کہا،

"بڑے زہریلے خیالات ہیں تمہارے مردوں کے بارے میں، بعض وقت تو مجھے اندیشہ ہونے لگتا ہے، کہیں مجھ سے بھی تو نفرت نہیں کرتی ہو، آخر مرد میں بھی ہوں۔ لیکن تسنیم سب کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکا کرو!

"میں کوئی بالکل بحث نہیں کرتی، آپ نے خواہ مخواہ زرینہ کو پارسا بنانے کی کوشش کی تو یہ باتیں خودبخود زبان پر آگئیں —— آپ کہہ سکتے ہیں پھر زرینہ کو جہنم میں کیوں دھکیل رہی ہو؟"

"ہاں بتاؤ!"

اس کا جواب یہ ہے کہ مچھلی کی اولاد مچھلی ہی بن کر زندہ رہے گی، ہماری اولاد

بھی آبرو باختہ ہی بن کر زندہ رہ سکتی ہے، کسی اور طرح نہیں!"
"لیکن اب تم خود یہ زندگی ترک کر رہی ہو تو آخر زرینہ کی ٹریننگ کیوں کیے جا رہی ہو؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ آخر ہماری شادی ہونے والی ہے، اس کے بعد کیا کرو گی؟"
"تو کیا آپ مجھے قید کر لیں گے؟"
"قید کیوں کروں گا لیکن آبرو باختگی تو ختم ہو جائے گی!"
تسنیم نے کہا،
"پہلے شادی تو ہو لینے دیجیے، پھر یہ باتیں کیجیے گا!"
"لیکن اب شادی میں کسر کیا ہے؟"
"اجازت ملی آپ کو؟"
"ہاں مل گئی!"
"آپ کو خدا کی قسم سچ کہیے گا!"
"ہاں ہاں سچ کہہ رہا ہوں مل گئی اجازت!"
"کب؟"
"آج!"
"کیسے؟"
"بس مل گئی، تمھیں آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے؟"
"تعجب ہے مجھے!"
"کیسا تعجب؟"

"یہی کہ آپ کے والد نے اجازت دے دی!"

"تعجب ہوا یا افسوس، لیکن اجازت بہر حال مل گئی، میں یہی کہنے آیا تھا بتاؤ اب کیا رائے ہے؟"

رائے کیا ہے شادی ہو گی!"

"لیکن کب؛ قیامت میں؟"

"قیامت کا دن شادی کے لیے نہیں ہے، اس دن فیصلہ ہو گا، انصاف اور عدل کے پیدا کرنے والے کا فیصلہ!"

"پھر بہک چلیں تم ——— جواب دو!"

"کہہ تو دیا شادی ہو گی!"

"اب یہ بھی بتاؤ، کس دن؟"

"جمعہ کو!"

انور خوشی سے بے قابو ہو گیا، اس نے مسرت کے جوش میں چیخ کر کہا،

"جمعہ تو کل ہے کل؟"

"جی یہ جمعہ نہیں!"

اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا،

"پھر کون سا؟"

"جب ارادہ کریں گے کوئی سا جمعہ بھی تعین کر لیں گے، جمعہ کوئی وقت تو ہے نہیں کہ جا کے پھر نہ آئے، یہ دن تو ہفتہ میں ایک بار آیا کرتا ہے!"

انور پھر جیسے اداس سی ہو گئی، اس نے کہا،

"ستانے میں تمہیں لطف آتا ہے شاید!"

"جی بالکل نہیں!"

"کیسے مان لوں؟ ـــــــ کون سا دن ہے جب تم مجھے ستاتی نہ ہو، میری امیدیں نہ توڑتی ہو، میرے دل پر چرکے نہ لگاتی ہو، لیکن میں خاموشی سے سہتا رہتا ہوں ان مظالم کو!"

"کیا کہنا ہے آپ کی خاموشی کا!"

انور نے ذرا جھنجلا کر کہا،

"تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو، میں سمجھتا ہوں مجھے مایوس ہو جانا چاہیے!"

اس قدر جلد آپ مایوس ہو جاتے ہیں، جس کا کوئی ٹھکانا نہیں، جب کہہ دیا کہ شادی ہوگی، تو آپ کو یقین رکھنا چاہیئے!"

انور نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے ایک نظر تسنیم کے چہرہ پر ڈالی اور چپ چاپ بیٹھ گیا، تسنیم بھی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی،

"آپ چپ کیوں ہو گئے؟

"اس لیے کہ بولنے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا!"

"آپ تو خفا ہو گئے! ـــــــ اچھا یہ بتایئے، مجھے آپ کتنی مہلت دے سکتے ہیں، شادی کی تیاری کی؟

انور کا افسردہ چہرہ پھر شاداب ہو گیا، اس نے کہا،

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ!"

وہ ٹھنک کر بولی،

"نہیں یہ کم ہے، کچھ اور بڑھائیے!"

"اچھا دو ہفتے سہی!"

"یہ بھی کم مدت ہے!"

"پھر؟ سال بھر؟"

"نہیں!"

"چھ مہینے!"

"نہیں چھ مہینے بھی نہیں!"

"تو آخر تم ہی کچھ کہو!"

"مان لیں گے آپ؟"

"ماننا ہی پڑے گا!"

"ایک مہینہ!"

"پھر مزید مہلت تو نہ مانگو گی؟"

"نہیں!"

"اور اگر مانگی؟"

"تو آپ میرا منہ نہ دیکھیئے گا!"

"اس میں تمھارا نقصان کیا ہوگا؟"

تسنیم نے شگفتہ روئی کے ساتھ کہا،

"مان جائیے! ایک مہینہ سے ایک دن زیادہ نہ ہوگا؟"

"مان لوں؟"

"بے تاشل!"

انور کے چہرے پر پھر خوشی کا نور برسنے لگا، تسنیم نے کہا،

"وہ کیرم کھیلیے گا؟"

"ضرور کھیلیں گے!"

کھیل شروع ہوگیا۔

باب ۳۵

کاروبار

داور اور قاسم سیٹھ میں باتیں ہو رہی تھیں، سیٹھ صاحب نے داور سے کہا

"آپ نے روپیہ اب تک واپس نہیں کیا؟"

داور نے سر کھجاتے ہوئے کہا،

"واپس کر دوں گا سیٹھ صاحب"

سیٹھ صاحب بولے،

"اس طرح کے وعدے تو بہت سے کر چکے ہیں آپ، یا تو رقم واپس کیجیے، ورنہ کاغذ سالیسیٹر کے حوالہ کرتا ہوں!"

داور کا رنگ فق ہو گیا، اس نے سیٹھ صاحب کی کتنی خدمتیں کی تھیں، انھوں نے تھیٹر کی جس ایکٹرس کو پسند کر لیا، وہ ان کے حجلہ عروسی میں پہنچا دی گئی، سیٹھ صاحب نے اپنی شریک عشرت کو "بخشش" چاہے جتنی دے ڈالی ہو، لیکن داور نے اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ نہیں طلب کیا، اور اس لیے نہیں طلب کیا کہ وہ چاہتا تھا کہ کوئی آئینہ میں سمجھ لے، کوئی آرسی ہیں، وہ روپیہ قرض دیتے تھے، اس کے معاوضہ ہیں، وہ عورتوں کو ان کی خدمت میں پیش کرتا تھا، بجائے انعام دینے کے اتنی رکھائی سے روپیہ طلب

کرنا کون سی شرافت ہے؟ شاید وہ نہیں جانتا تھا، روپیہ کے کاروبار میں شرافت کا سکہ نہیں چلتا، ریس اور سٹہ میں وہ سارا روپیہ ہار چکا تھا، تھیٹر کی آمدنی کا بڑا حصہ بھی اسی مشغلہ میں صرف ہو رہا تھا، صرف تسنیم کی تنخواہ تو وہ پابندی سے ادا کر دیتا تھا باقی اداکاروں کو وعدۂ فردا پر عرصہ سے ٹال دیتا تھا، آج دراصل وہ سیٹھ صاحب سے کچھ مزید روپیہ قرض لینے آیا تھا، کیونکہ تسنیم جس نئے کھیل کو ڈائرکٹ کر رہی تھی اس سلسلہ میں نئے سازو سامان کا تقاضا کر رہی تھی، کم از کم ۲۵ ہزار روپیہ کی اور ضرورت تھی، سخت مشکل یہ تھی کہ یہ مطالبہ تسنیم کی طرف سے تھا، کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ٹال بھی جاتا، تسنیم کے مطالبہ کو ٹالنے کے معنی یہ تھے کہ تھیٹر میں تالا لگا دیا جائے، کیونکہ وہ پھر ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی تھی، داور سوچنے لگا یہ تو بڑی مشکل ہوئی، آئے تھے نماز بخشوانے گلے پڑ گئے روزے، مزید روپیہ ملنا تو الگ رہا، یہاں قرقی ڈگری کی باتیں ہو رہی ہیں، اس نے بڑے مغموم لہجہ میں کہا،

"کچھ دن تو اور مہلت دیجیے!"

"ایک سال ہو گیا، اب میں ایک دن کی بھی مہلت نہیں دے سکتا!"

"دیکھئے سیٹھ صاحب ہمارا نیا کھیل جو آنے والا ہے، یہ ساری کسر پوری کر دے گا، اپنی ایک ایک پائی لے لیجئے گا گن کر ——— ایسا کھیل ہے قیامت کا کہ پبلک ٹوٹ پڑے گی!"

"نیا کھیل کیسا؟"

"ارے وہی جسے مس تسنیم خود تیار کر رہی ہیں!"

"بڑا عمدہ ہے!"

"عمدہ؛ سیٹھ صاحب حالت یہ ہے کہ ہمارے اداکار، ریہرسل کے بعد روتے ہوئے نکلتے ہیں!"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اس کھیل میں، جو دیکھے گا، وہ آنسو بہائے بغیر نہیں رہے گا، اور پبلک کو قہقہہ میں بھی وہ لطف نہیں ملتا جو آنسو میں ملتا ہے!"

"لیکن میں جانتا ہوں کھیل کامیاب ہوگیا، جب بھی روپیہ آسانی سے نہیں دوگے تم!"

"کیوں نہیں دوں گا سرکار؟"

"پھر ریس اور سٹہ میں لگاؤ گے؟ مجھے سب معلوم ہے!"

"اچھا ایک کام کیجیے!"

"کون سا؟"

"آپ ریسیور بن جائیے!"

"کیا مطلب؟"

"کمپنی کا چارج آپ لے لیجیے"

"کیوں؟"

"سنیئے تو، ذرا کہنے تو دیجئے، اصل بات!"

"کہو کہتے کیوں نہیں؟"

"ہاں تو آپ ریسیور بن جائیے، اس نئے کھیل کی تیاری میں جتنے روپیہ کی ضرورت ہو لگائیے، اور آمدنی سے وصول کر لیجیے سب!"

"پاگل ہوئے ہو، میں اس چکر میں نہیں پڑتا!"

"سنیے تو"

لاحول ولا قوۃ، کہہ ہی چکے، اب کیا سنا رہے ہو؟"

"نفع میں شریک بن جائیے!"

"شکریہ مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں!"

داور نے جل کر کہا،

"تو کمپنی نیلام کرا دیجیے، مجھے جیل بھجوا دیجیے، روپیہ تو ہے نہیں!"

"میں یہ دونوں کام کروں گا، روپیہ نہ ملے کوئی مضائقہ، تمھیں سبق تو مل جائے گا!"

"تو سبق دینے کے لیے عدالت میں کیوں کھینچتے ہو سیٹھ صاحب؟ یہیں جوتے مار لو، جتنے چاہو، سر جھکا ہوا ہے!"

"تم ان میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے! —— مجھے تو روپیہ چاہیے، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا!"

"تو انکار کسے ہے روپیہ دینے سے؟"

"تمھیں!"

"بالکل نہیں: —— پہلے کا وقت نکلا جا رہا ہے، دوسرا کاغذ لکھا لو!"

"آخر کیوں؟ کب تک کاغذ بدلتا رہوں، فیصلہ کیوں نہ کر دوں؟"

داور کوئی جواب نہ دے پایا تھا، کہ تسنیم برق و شرر بنی ہوئی، مسکراتی، بجاتی بجلیاں برساتی آئی، اسے دیکھ کر داور تو دبک گیا، سیٹھ صاحب کھل گئے، انھوں نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا،

"اب تو دس دس دن گذر جاتے ہیں، دیدار نہیں ہوتا!"

تسنیم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا،

"آج کل بہت مصروف ہوں!"

"خیریت؟ کیوں؟"

"ایک طرف آپ تقاضا کرتے ہیں کہ شادی جلد ہونی چاہیے ــــ"

سیٹھ صاحب تسنیم کو منع نہ کر سکے، لیکن بغیر کسی وجہ کے زور سے انھوں نے کھنکھارا تاکہ یہ الفاظ پورے طور پر داور کے کان میں نہ پڑنے پائیں، لیکن وہ کانوں کا تیز تھا اس نے ایک ایک حرف سن لیا، سیٹھ صاحب نے داور سے اب تک اس کا ذکر نہیں کیا تھا، اگرچہ وہ ان کا محرمِ اسرار تھا، اس بے موقع انکشافِ راز سے وہ گھبرا گئے، اور داور چونک پڑا تسنیم نے بے پروائی کے ساتھ سلسلہ کلام جاری رکھا،

"لیکن میں کہہ چکی ہوں، جب تک میں اپنا کھیل مکمل نہیں کر لوں گی، شادی نہیں کروں گی، آپ کی بیتابی پر ترس آگیا، اس لیے جلدی جلدی اسے مکمل کر رہی ہوں، شکریہ تو ادا نہیں کرتے، لگے شکوے شکایت کا دفتر کھولنے!"

سیٹھ صاحب یہ خوش خبری سن کر جامہ سے باہر ہو گئے، انھوں نے کہا،

"کب تک مکمل ہو جائے گا؟"

"یہی دس پانچ روز میں!"

"واقعی؟ سچ؟"

کوشش تو پوری کر رہی ہوں یہ ہمارے داور صاحب ایک سست ہیں، چند چیزوں کی کمی ہے، وہ پوری کر دیں، تو دو دن میں میرا کام ختم ہو جائے لیکن یہ آج کل، آج کل میں ٹالے جاتے ہیں!"

سیٹھ صاحب نے داور کو ڈانٹا،

"کیوں جی؟"

"جی!"

"کیا کہہ رہی ہیں یہ؟"

"اسی لیے تو آیا تھا!"

"اسی لیے آئے تھے تم؟"

"اور کیا!"

"لیکن تم نے ایک بات بھی نہیں کہی اس بارے میں!"

"کہتا کیسے؟ آپ نے عدالت کی دھمکی دینا شروع کر دی!"

سیٹھ صاحب مسکرائے

"اچھا ہم اپنی دھمکی واپس لیتے ہیں، کہو کیا کہتے ہو؟"

داور نے سوچا یہی موقع ہے، اس نے کہا،

"کچھ اور روپیہ چاہیئے!"

اب سیٹھ صاحب انکار نہیں کر سکتے تھے، پوچھا،

"کتنا؟"

"۲۵-۳۰ ہزار"

"ایک بات کہو؟"

"تیس ہزار!"

"اگر روپیہ تمھیں مل جائے تو سارا سامان کب تک مکمل کر کے دو گے مس تسنیم کو؟"

"کل!"

"سچ کہتے ہو؟"

"پوچھیے مس تسنیم سے کبھی جھوٹ بولا ہوں آج تک؟"

تسنیم مسکرانے لگی، اس نے کہا،

"میری گواہی نہ دلوایئے ورنہ ایک [illegible] نہیں ملے گا آپ کو ——— آپ سچ بولتے بھی ہیں کبھی؟"

سیٹھ صاحب اس وقت ترنگ میں تھے، انھوں نے کہا،

"تم ۳۰ ہزار نہیں ۳۰ ہزار لے لو لیکن سامان کل ہی ٹھیک کر دو، تاکہ ایک ہفتہ کے اندر اندر کھیل مکمل ہو جائے"

"کل ہی لیجیے سرکار"

سیٹھ صاحب نے چیک بک اٹھائی، اور ۳۰ ہزار کا چیک کاٹ کر داور کے ہاتھ پر رکھ دیا، اس نے ممنونیت کی نگاہ سے انھیں دیکھا، چیک جیب میں رکھ لیا اور کہا،

"کمپنی آپ کے اس احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی!"

تسنیم نے کہا،

"میں تائید کرتی ہوں ——— لیکن یہ بتائیے۔ یہ قرض ہے یا کمپنی کو بخشش ہے"

سیٹھ صاحب نے حاتمانہ تیور سے کہا،

بخشش! ——— یہ رقم اب واپس نہیں لوں گا! بشرطیکہ "

داور، جوشِ مسرت سے بے قابو ہو گیا، اس نے کہا،

"ضرور پسند آئے گا!"

تسنیم بولی،
"یہ تو میں ابھی کہہ سکتی ہوں کہ کھیل کو آپ بہت پسند کریں گے، بشرطیکہ کھیل اچھا ہوا!"

"بس تو یہ رد پیہ ہیں نے دیا!"

داور سیٹھ صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا، پھر اس نے کہا،

"سیٹھ صاحب ایک شکایت ہے آپ سے!"

"شکایت کیسی؟"

"یہ چپکے چپکے ———"

وہ مسکرائے،

"تم ہماری شادی کو کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں!"

"ہاں بھئی اس خبر کی تشہیر کی چنداں ضرورت نہ تھی!"

"لیکن ہم سے بھی؟ ہم تو پرانے خادم ہیں، کچھ خدمت ہی کرتے!"

"خیر ابھی وقت گیا کہاں ہے؟ ابھی تو اس کی آمد آمد ہے! ——— کیوں تسنیم؟"

تسنیم نے ایک جانسوز تبسم کے ساتھ کہا،

"اور کیا!"

داور نے سیٹھ صاحب کو اور زیادہ خوش کر لیا، اس نے کہا،

"کب ہوگی شادی، بڑی خوشی ہوئی ہمیں یہ سُن کر!"

سیٹھ صاحب تسنیم کی طرف دیکھ کر بولے،

"یہ ان سے پوچھو!"

داور کو تسنیم ذرا بھی منہ نہ لگاتی تھی، اُس نے تیکھی نظروں سے داور کو دیکھا جس سے اس کا حوصلہ پست ہو گیا، س نے تسنیم سے تو کچھ نہ کہا، البتہ سیٹھ صاحب سے گویا ہوا،

"بڑی اچھی جوڑی ہے خدا مبارک کرے!"

تسنیم جھنجلا گئی،

"یہ بھانڈوں کی طرح مبارک سلامت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے آپ نے، مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ باتیں ذرا بھی!"

داور سہم کر چپ ہو گیا، لیکن اس وقت سیٹھ صاحب موج میں تھے، انھوں نے تسنیم کو ٹوکا،

"دوست آدمی ہے، ہماری خوشی پر خوش ہوتا ہے!"

داور کو پھر بولنے کا موقع ملا،

"کوئی موقع ہو تو آپ دونوں کے پسینہ پر خون بہا دوں اپنا!"

سیٹھ صاحب نے دل دہی کرتے ہوئے کہا

"مجھے یقین ہے!"

تسنیم کی جھنجلاہٹ اب تک قائم تھی، اس نے کہا،

"جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں! —— آخر اس قسم کی باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بے نتیجہ، بے کار باتیں"

داور کو روپے مل چکے تھے، اس کی تلخ باتوں کو وہ شربت انگور کی طرح پی رہا تھا، بیس ہزار کا خالص نفع تھا، اس رقم میں، اس نے کہا،

کیجئے جو چاہیئے لیکن کہے دیتے ہیں، دوست ایک ہم ہی ہیں، باقی سب مطلب

کے بندے ہیں!"

تسنیم نے شریر نظروں سے سیٹھ صاحب کو دیکھا اور کہا،

"سن لیا آپ نے کیا کہہ رہے ہیں، آپ کے دوست آپ کے بارے ہیں؟"

سیٹھ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا، اور داور سے کہا،

"اب تم جاؤ!"

وہ چلا گیا،

تسنیم نے کہا،

"محفل سونی ہو گئی، بیچارے کے جانے سے!"

"جس محفل میں تم ہو، وہ کبھی سونی نہیں ہو سکتی! ـــــ تسنیم آج تم نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے! لیکن یہ دس بارہ دن کاٹے نہیں کٹیں گے!"

"کاٹ لیجیے انھیں کسی طرح، پھر تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے!"

"جب تک وہ مبارک دن نہ آجائے مجھ پر تو جاں کنی کی کیفیت طاری رہے گی زندگی میں خلا سا معلوم ہوتا ہے تمھارے بغیر، تم آجاتی ہو تو زندگی بامعنی اور بامقصد معلوم ہونے لگتی ہے، تم نہیں ہوتیں، تو سنسان اور بے کیف بن جاتی ہے!"

"آپ کی ان ہی میٹھی میٹھی باتوں نے مجھے رام کیا ہے، ورنہ میں شادی کے جنجال میں کہاں پھنسنے پر بھلا تیار ہوتی، لیکن ایک ڈر سا لگتا ہے، نہ جانے کیوں؟"

"ڈر کیسا؟"

"یہی کہ اس وقت تو میں آپ پر حکومت کر رہی ہوں لیکن جب آپ حاکم بن جائیں گے میرے جسم و جان کے، تب کیا سلوک کریں گے میرے ساتھ؟"

سیٹھ صاحب نے مجنوں، اور فرہاد کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے فرمایا،

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں حاکم بن جاؤں گا؛ یہ ہو سکتا ہے؟ اس دل پر تمھاری حکومت ہے، اور زندگی کی آخری سانس تک تم ہی حکمراں رہو گی، میرے دل پر بھی!"

"اماں کہہ رہی تھیں، بڑے بڑے گبرو جوان تجھ پر مرتے ہیں، انھیں چھوڑ کر ایک بوڑھے سے شادی کرنے چلی ہے!"

"یہ الفاظ تیر و نشتر بن کر سیٹھ کے بوڑھے اور کمزور دل پر لگے، لیکن جب نسیم نے یہ کہا کہ

"لیکن میں نے ان سے کہا، محبت بڑھاپے اور جوانی کو نہیں دیکھتی، جتنی محبت سیٹھ صاحب مجھ سے کرتے ہیں، اس سے زیادہ میں ان سے کرتی ہوں، اور پھر وہ ایسے بوڑھے بھی کون سے ہیں ۴۴، ۴۵ سال کے!"

یہ بالکل خلاف واقعہ بات سن کر سیٹھ صاحب باغ باغ ہو گئے، ان کا جی چاہا، اپنا سینہ چیریں اور دل کے چمن میں اس پھول کو رکھ لیں، وہ سوچ رہے تھے، کتنی شریف اور بلند کردار کی ہے، یہ عورت جو اپنی محبت میں اتنی مستقل ہے کہ ماں تک کے ورغلانے میں نہیں آئی، انھوں نے ایک عجیب تاثر کے عالم میں کہا،

"نسیم! تم میری روح ہو، روح اور دل کی مالک ہو ـــــ مجھے ہرگز اس کا اندازہ نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو ـــــ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے وہ بھی کیسی بنجر زمین کو گلزار بنا دیتی ہے، کچھ بھی ہو میں تم سے کافی بڑا ہوں، مجھ میں وہ جاذبیت بھی نہیں، جو آج کل کے لونڈوں میں ہے، پھر بھی تمھارا مجھ سے محبت

کرنا اور مخالفوں کو ساکت کر دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ شرافت کسی کی میراث نہیں ہے، وہ جس طرح کسی شریف گھرانے کی بہوؤں، بیٹیوں میں ہوتی ہے، اسی طرح اسٹیج پر گانے والی اور پردۂ فلم پر رقص کا کمال دکھانے والی عورتوں میں بھی مل سکتی ہے!

اب تک میں تمھاری الفت کا گرفتار تھا، لیکن آج سے میری نظر میں تم عزت، وقعت بلکہ عقیدت کی مستحق ہو گئی ہو!"

تسنیم سیٹھ صاحب کی اس بوالہوسی سے پورا پورا لطف لے رہی تھی، اس نے کہا،

"لے اب زیادہ نہ بنائیے چپ بھی رہیے!"

سیٹھ کا تاثر بدستور قائم تھا، فرمایا،

"ہاں مجھے چپ ہی رہنا پڑے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے الفاظ نہیں ملتے، تم سے باتیں کرنے کے لیے مجھے الفاظ سوچنا پڑتے ہیں!"

آپ ایسی باتیں کریں گے، تو مجھے ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہو جائے گی اپنے بارے میں، پھر میں سوچنے لگوں گی کہ میں بھی کچھ ہوں!"

سیٹھ صاحب نے پورا جوش زبان کی طرف منتقل کر کے کہا،

"کچھ؟ ارے میں کہتا ہوں، تم وہ ہو جس کی مثال نہیں مل سکتی، اس دنیائے دوں میں!

——— کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم کیا ہو؟"

اس نے محبت بھری نظروں سے انھیں دیکھ کر کہا،

"کوئی مجھ سے پوچھے تو میں بتا دوں کہ آپ کیا ہیں؟ انسان کے لباس میں بالکل ———"

سیٹھ صاحب نے تسنیم کے الفاظ کو دہراتے قطع کلام کرتے ہوئے بولے،

"تم ایسی باتیں کرو گی تو مجھے ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہو جائے گی اپنے بارے میں،

پھر میں سوچنے لگوں گا کہ ہاں میں بھی کچھ ہوں !،،

تسنیم نے سیٹھ کا نشہ اور تیز کر دیا،

،،ضرور سوچیئے آپ بہت کچھ ہیں، آپ میرے بارے میں کہتے ہیں، اور میرا آپ کے بارے میں خیال ہے کہ اس دنیا میں آپ کی مثال ملنا مشکل ہے !،،

سیٹھ صاحب نے اپنی عمر کا خیال کیئے بغیر کسی فلم کے نوجوان ہیرو کی طرح بے ساختہ تسنیم کا ہاتھ پکڑ لیا، اور بھرائی ہوئی آواز میں لرزتے ہوئے الفاظ ان کے منہ سے نکلے !،،

تسنیم، تسنیم !،،

لیکن تسنیم نے اس لب و لہجہ میں جواب نہیں دیا، اُس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے کمزور پنجہ سے چھڑا لیا، تسنیم کے جذبات اس وقت بھی سرد تھے، بالکل سرد جیسے برف، اور سیٹھ صاحب باہمہ شیخوخیت، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکیسر کہربا بنے ہوئے ہیں، وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے لٹکے ہوئے پاؤں کانپ رہے تھے، اس وقت اگر وہ کھڑے ہوتے تو ضرور گر پڑتے، ان کا وہ ہاتھ بھی کانپ رہا تھا جو بجلی کے خزانہ یعنی تسنیم کے ہاتھوں سے مس ہو کر ابھی ابھی واپس آیا تھا، اور ان کا دل بھی کانپ رہا تھا، حلق خشک ہو گیا تھا، ہونٹ سوکھ گئے تھے، انھوں نے بیتاب ہو کر آواز لگائی،

"پانی !،،

اور وہی بوڑھی خادمہ چاندی کے ایک گلاس میں برف کا ٹھنڈا پانی لے کر نمودار ہوئی ——— !

سیٹھ صاحب نے غٹ غٹ سارا گلاس پی لیا، تب جا کر دل بے قرار کو قرار حاصل ہوا۔

باب ۳۶

دعوت

انور، اور تسنیم آمنے سامنے بیٹھے تھے، انور نے کہا،

"اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں!"

تسنیم نے شاہی وقار کے ساتھ کہا،

اجازت ہے!

"اعلیٰ حضرت نے ایک مہینہ کی جو مہلت لی تھی۔ وہ ختم ہو رہی ہے پرسوں!"

تسنیم نے شاہی لب ولہجہ میں کہا،

"ہمیں یاد ہے، ہم اپنا وعدہ کبھی نہیں بھولتے! —— ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمھیں مالا مال کر دیں گے سائل!"

لفظوں کا یہ کھیل جاری تھا کہ زرینہ آ گئی، تسنیم نے اسے دیکھ کر کہا،

"تیار ہو جاؤ، میرے ساتھ چلنا ہے تمھیں ریہرسل میں!"

"ابھی آئی!"

وہ جیسی خوش خوش آئی تھی، ویسی ہی خوش خوش چلی گئی، انور نے کہا،

"اسے ریہرسل میں بھی لے جاتی ہو تم؟"

ہاں تو کیا ہوا؟"

"گانا گھر پر سیکھ رہی تھی، خیر، اب اسٹیج پر بھی دھما چوکڑی مچائے گی!"

تسنیم نے مسکرا کر کہا،

"آپ آرٹ کو دھما چوکڑی کہتے ہیں"

"لعنت ہے ایسے آرٹ پر!"

"ارے آپ تو خفا ہو گئے!"

"کاش میری خفگی تم پر کچھ اثر کر سکتی!"

"اونہہ، سنیئے تو!

کیا سنوں؟ تمھاری ان باتوں سے میرا دل کباب ہو جاتا ہے جل کر!"

"ارے جناب! آدمی ہیں آپ، کہ!

"ہاں! تمھارے اور زرینہ کے معاملہ میں، تمھارے معاملہ میں کم اور زرینہ کے بارے میں زیادہ!"

"کیوں؟"

"تمھاری صلاح رفتہ رفتہ ہو سکے گی، اور زرینہ تو ابھی بالکل معصوم ہے!"

"اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو، کچھ کام کی باتیں کیجئے!"

"کام کی بات یہی ہے کہ مہینہ ختم ہونے میں صرف دو دن باقی ہیں، اب کہو کیا ارادہ ہے؟ ایفا ہو گا یا اب بھی نیا شاخسانہ نکل آئے گا؟

تسنیم نے انور پر ایک پیار کی نگاہ ڈالی اور کہا،

رات ختم ہوئی، اور سورج نکل آیا!

انور نے کہا،

میں نہیں سمجھا یہ پہیلی !"

اب کوئی نیا شاخسانہ نہیں نکلے گا، اب وعدہ کا ایفا ہوگا!"

انور کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوگیا، اُس نے کہا،

"ہوئے تب جانوں!"

"اب بھی آپ کو اعتبار نہیں آتا"

"مجھے تو آتا ہے لیکن "

"اور کسے نہیں آتا؟"

اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار آتا!"

تسنیم ہنس پڑی،

"اللہ رے بدگمانی!"

"میری جگہ تم ہوتیں تو خودکشی کر چکی ہوتیں!"

"یہ نہ کہیے اور سب کچھ کہیے!"

وجہ؟ سبب؟ کیوں نہ کہوں؟"

"آپ ہوتے میری جگہ، تو خودکشی کر کے بھی چین نہ پاتے!"

"ایسی باتیں نہ کرو تسنیم!"

"بہت اچھا نہ کروں گی ایسی باتیں، دیکھیے کس قدر جلد آپ کا کہنا مان لیتی ہوں، پھر بھی آپ ہیں کہ شکوے کیے جاتے ہیں۔

"اچھا اب نہیں کریں گے شکوے ——— حالانکہ شکوہ بھی محبت ہی

میں ہوتا ہے !"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، تسنیم اُٹھ کر ٹیلیفون کے پاس گئی، رسیور اٹھا کر اس نے گفتگو شروع کر دی،

"ہاں میں تسنیم بول رہی ہوں !"

کیا کہہ رہے آپ داور صاحب ؟ ——— پندرہ دن کی سیٹیں بک ہو گئیں ؟ میں نے تو آپ سے کہا تھا صرف کل کی سیٹیں بک کیجیے گا، خیر ——— لیکن سنیئے تو ——— میں کہہ رہی ہوں، میں نے جو تین باکس، اپنے احباب کے لیے رزرو کرائے تھے، وہ تو نہیں بک کر دیئے کہیں آپ نے ——— شکریہ ——— !"

تسنیم پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی، اُس نے انور سے کہا،

"ہاں صاحب تو آپ کو تھیٹر بالکل پسند نہیں ہے ؟"

انور نے مسکرا کر جواب دیا،

"بالکل نہیں !"

"اگر میں اصرار کروں کہ چلیئے دیکھیے، تو آپ کیا کریں گے ؟"

"دیکھوں گا !"

"شکریہ ! ——— تو کل تیار رہیے !"

"بہت خوب، جان و دل سے حاضر ہو جاؤں گا ——— ہاں یہ تو بتاؤ تمھاری نئی فلم کب آ رہی ہے ؟"

"آ جائے گی وہ بھی پہلے یہ ڈرامہ تو دیکھ لیجیے !"

"کہہ دیا تم سے، آؤں گا، ضرور آؤں گا، کس وقت پہنچ جاؤں ؟"

"ٹھیک نو بجے پہنچ جایئے، مجھے تو آپ کے استقبال کا موقع نہیں ملے گا، کسی کو اپنا نام بتا دیجئے گا، وہ آپ کو میرے پاس پہنچا دے گا!"

"اچھی بات ہے ——— اب مجھے بھی اشتیاق پیدا ہو رہا ہے!"

"کاہے کا اشتیاق؟"

"دیکھوں اداکاری کے لباس میں کیسی لگتی ہو تم؟"

"کچھ نہیں، جو اب ہوں، وہی جب رہوں گی!"

"میں نہیں مانتا، اب تو تم قیامت ہو، جب قیامت سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر بن جاتی ہو گی؟"

"یہی سہی، آیئے دیکھ لیجئے آ کر!"

آؤں گا، لیکن ایک شرط ہے!"

"فرمایئے، کیا ہے شرط؟"

"میرے باکس میں، میرے سوا کوئی اور نہ ہو، آپ کے دوست احباب میں سے

اس میں کیا مصلحت ہے؟

"مصلحت یہ ہے کہ ؏

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری!"

تسنیم ہنس پڑی، اس نے کہا،

"خدا سب کچھ بنائے، لیکن مرد نہ بنائے کسی کو، عجیب ذاتِ شریف ہوتے ہیں، یہ بزرگوار بھی!"

"بجا ارشاد ہوا، جان نثاروں کا اسی طرح مذاق اڑایا جاتا ہے! یہ بتایئے

میری فرمائش پوری ہو گی یا نہیں ؟"
"کیوں نہ ہو گی، آپ کچھ فرمائیں اور اس کی تعمیل نہ ہو، یہ ممکن کیوں کر ہے ؟
حکم ہو تو آپ کے سوا تھیٹر ہال میں پرندہ بھی نہ مار سکے کسی کو اجازت نہ دی جائے،
حاضر ہونے کی، سب کے ٹکٹ واپس کر دیئے جائیں ؟"
"جی تو یہی چاہتا ہے لیکن تمھاری خاطر سے اتنی بڑی شرط نہیں پیش کرتا !"
"شکریہ !"
اتنے میں زرینہ آ گئی، اسے دیکھ کر تسنیم اُٹھ کھڑی ہوئی
"آپ تشریف رکھیے میں جاتی ہوں !"
"میں بھی جاتا ہوں، اب کل ملاقات ہو گی !"
"یہاں، یا تھیٹر میں ؟"
"دونوں جگہ، یہاں بھی اور وہاں بھی !"
انور اپنے گھر چلا آیا، اور تسنیم زرینہ کو لے کر کمپنی چلی گئی،
آج انور کی حالت یہ تھی کہ پاؤں رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے، صرف ۴۸ گھنٹے
کے بعد تسنیم اس کی ہو جائے گی ——— تسنیم اس کے خوابوں کی دنیا، اس کے
دل کی رانی، اس کے خیالات کی ملکہ، اس کی روح زندگی، دل سب کچھ!
وہ سوچ رہا تھا، تسنیم جب میری ہو جائے گی، جب بلا شرکتِ غیرے میں اس کا
مالک بن جاؤں گا تو مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی خوش قسمت آدمی ہو گا کوئی دنیا میں ؟
جسے تسنیم مل جائے جس کی تسنیم ہو جائے اسے پھر کیا چاہیئے، پھر وہ دنیا کی کون سی
نعمت ہے جو اسے حاصل نہیں ہے لیکن کہیں وہ مکر تو نہیں جائے گی، دھوکا تو نہیں

دے گی؟"

رات کو بڑی دیر تک وہ یہی سوچتا رہا، پھر نہ جانے کب اسے نیند آگئی، خواب میں اس نے بہت دنوں کے بعد نوشابہ کو دیکھا، مرجھایا ہوا چہرہ، سوکھے ہوئے ہونٹ، پھٹے کپڑے، میلے بال، پچکے ہوئے گال، وہی گال جو کبھی گلاب کی طرح سرخ تھے نوشابہ کو دیکھ کر اس نے کوشش کی کہ کترا کر نکل جائے، لیکن وہ راستہ روک کر کھڑی ہوگئی، اُس نے کہا،

"مجھے معلوم ہے آپ کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ آپ ایک ایکٹرس سے شادی کرنے جا رہے ہیں، لیکن سچ بتایئے گا کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟ آج آپ اس سے پیمانِ محبت باندھ رہے ہیں، کل اسی طرح مجھ سے بھی تو چاہ اور نباہ کی باتیں کیا کرتے تھے آپ! آج آپ اس خیال سے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں کہ کل وہ آپ کی ہو جائے گی، لیکن دماغ پر زور دے کر ذرا یاد تو کیجیے، کبھی میرے لیے بھی تو آپ دیوانے بنے رہتے تھے ہر وقت، آج آپ اس ... شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کبھی شادی کرنے کا یہی جوش مجھ غریب اور جاہل ... لڑکی کے ساتھ بھی تو تھا، آج آپ کا دل دھڑک رہا ہے کہ کہیں یہ ایکٹرس پھر آپ کو دھوکا نہ دے، شادی کا دھوکا دے کر مکر نہ جائے؟ لیکن سینہ پر ہاتھ رکھ کے انصاف سے کہیے، کیا آپ مجھے دھوکا نہیں دے چکے ہیں؟ کیا آپ میری زندگی نہیں برباد کر چکے ہیں؟ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے بعد نہ جانے کتنی عورتوں سے ناتہ جوڑا، لیکن یاد رکھیے نوشابہ جب تک زندہ رہی غیر مرد کی طرف دیکھنا بھی حرام سمجھتی رہی، آپ اس ایکٹرس کی لڑکی کو اس طرح چاہ رہے ہیں جیسے اس کے باپ ہوں، لیکن آپ نے کبھی سوچا، آپ مجھے چھوڑ کر اس وقت بھاگے

تھے، جب میں ایک دوشیزہ سے انجان پنے میں ماں بن رہی تھی، آپ نے میری خبر نہ لی اچھا کیا، اپنی اولاد کو تو نہ ٹھکرا دیتے، اتنے میں جھاڑی میں سے ایک خوبصورت سا بچہ دوڑتا ہوا آیا، اور نوشابہ کے پاؤں سے لپٹ گیا، اُس نے بچہ کو گود میں اُٹھا لیا، اور رونے لگی، بچہ نے پوچھا،

"ماں تو روتی کیوں ہے؟"

وہ بولی،

"میرے نصیب میں یہی لکھا ہے، دیکھ یہ تیرا باپ کھڑا ہے، جو تیری طرف نظر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتا، میں نے اپنی زندگی رو دھو کر کاٹ لی، لیکن تجھے کون پالے گا؟ کیوں کر پروان چڑھے گا تو؟ کس طرح تیری ضدیں پوری ہوں گی؟"

وہ خوبصورت بچہ ماں کو روتا دیکھ کر رونے لگا، انور اس کی طرف بڑھا، لیکن اب نہ وہاں نوشابہ تھی، نہ بچہ، ایک مرجھایا ہوا پھول اس کے قدموں کے سامنے پڑا تھا، ایک سوکھی ہوئی شاخِ گل، اس کے پیروں کو چوم رہی تھی،

" دفعتہً اس کی آنکھ کھل گئی، وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا، اب رات ختم ہو چکی تھی، صبح کا جھٹپٹا وقت تھا، قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی، وہ کھڑ بھڑا کر اُٹھ بیٹھا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، آج نہ جانے کیوں نوشابہ اسے یاد آ رہی تھی، اور اس کا دل کہہ رہا تھا، تو نے نوشابہ کو دھوکا دیا، تسنیم تجھے دھوکا دے گی، قدرت کا یہی انتقام ہے، وہ کسی جرم کو معاف نہیں کرتی، ہر خطا کی سزا دیتی ہے، ہر گناہ کا انتقام لیتی ہے

انور لرز گیا، اس کا دل آماجگاہِ اوہام بن گیا، وہ اطمینان، وہ سکون، وہ جوش مسرت جو تسنیم کے ہاں سے ساتھ لے کر آیا تھا، کافور ہو گیا، وہ امیدوں کا ہرا بھرا

چمن جس میں بہار ہی بہار تھی، تاراج خزاں ہو گیا، وہ نشاط خاطر جس نے غم اور فکر کا خاتمہ کر دیا تھا، چھن گئی اور اس کی جگہ ایک نامعلوم پریشانی نے لے لی تھی، خیالات وہی تھے لیکن پریشان کن! رہ رہ کر اس کے دل میں خیال آتا تھا، اگر کہیں قدرت نے واقعی انتقام لیا تو کیا ہو گا؟ کیا تسنیم مجھ سے چھن جائے گی؟ کیا میں تسنیم کو اپنے جان و دل کا مالک نہیں بنا سکوں گا؟ اگر ایسا ہوا تو زندگی بیکار رہے، لیکن کشمکش کی زندگی نہیں بسر کروں گا، ختم کر دوں گا اپنی نامراد اور ناکام زندگی کو۔

باب ۳۷

تماشا

قاسم سیٹھ اُس سپاہی کی طرح جلدی جلدی لقمے نگل رہے تھے۔ جو جنگ کا بگل سن چکا ہو، اور کمر کس کر میدان جنگ میں جانے کے لیے بے قرار ہو، آج ان کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی، معلوم ہوتا تھا کہ کہیں بر دکھوے میں جا رہے ہیں، وہ پھبن تھی، اُن کے لباس اور اطوار میں جیسے بندر کے غدود کا پیوند آج ہی لگوایا ہے انھوں نے،

اتنے میں انور ناخواندہ مہمان کی طرح ٹپک پڑا، اس کی سج دھج بھی آج دیکھنے کے قابل تھی، معلوم ہوتا تھا کسی وقت اس میں سوئمبر کی رسم انجام پانے والی ہے اور یہ اپنے وقت کا پرتھوی راج اپنی محبوبہ سنجوگتا کو، حریفوں، اور رقیبوں کے سامنے سے چھین ہی تو لائے گا، اول تو سیٹھ صاحب کو اس وقت انور کا آنا ناگوار گزرا، دوسرے اس سج دھج میں اسے بالکل اپنا حریف مقابل دیکھ کر وہ جل ہی تو گئے بڑی بے رخی کے ساتھ فرمایا،

"اس وقت تم کیسے آ گئے ؟"

ایک بہت ضروری کام سے !"

"مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، پھر کسی وقت گفتگو ہو گی!"

"میں گفتگو کرنے نہیں آیا، ہوں، صرف اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں!"

"استغفراللہ اتنی دیر سے برابر گفتگو کیے جا رہے ہو اور انکار بھی ہے گفتگو کرنے سے فرمایے کون سی اطلاع دینے آپ تشریف لائے ہیں؟"

انور نے ذرا شرماتے ہوئے کہا۔

"کل"

وہ خاموش ہو گیا، سیٹھ صاحب کو بھڑکنے کا موقع مل گیا،

کچھ آگے بھی تو کہو، کل کیا ہو گا؛ قیامت آجائے گی؛ مجھے پھانسی ملے گی؛ تم بادشاہ بنا دیے جاؤ گے، آخر کیا ہو گا کل؟"

انور اس وقت بہت خوش تھا، اتنا خوش کہ باپ کی کڑوی کسیلی باتوں کی اس نے ذرا بھی پروا نہ کی، اس نے مسرت کے عالم میں کہا،

"کل کی تاریخ مقرر ہوئی ہے!"

"تاریخ کاہے کی؟"

"میں نے عرض کیا تھا نا"

"اوہ، میں سمجھا شادی کی تاریخ! کل تم شادی کر رہے ہو؟"

"جی!"

"اسی ایکٹرس سے؟"

"جی!"

مبارک ـــــ لیکن میں تو شریک نہ ہو سکوں گا، معذور ہوں!"

"کیوں ؟"

"کل ہی تو میری شادی بھی ہے!"

اس نے حیرت سے پوچھا،

"آپ کی ؟"

"ہاں میری ——— تمھیں حیرت کیوں ہے ؟ شادی تم ہی کر سکتے ہو میں نہیں کر سکتا"

"کیوں نہیں کر سکتے لیکن کہاں ہو رہی ہے ؟"

"یہیں، میرے اسی خلوت کدہ میں چند احباب آجائیں گے اور شادی ہو جائے گی!"

انور نے ذرا رکتے رکتے پوچھا،

"میرا مطلب یہ تھا کہ کس گھرانے میں ہو رہی ہے ؟"

سیٹھ صاحب نے زہر خند کرتے ہوئے کہا،

"گھرانہ! ——— بیٹا جب تم نے گھرانے کی پروا نہیں کی جس سے آگے نسل چلے گی، تو میں کیوں اس کا خیال کروں ؟ مجھ سے اب نسل تو نہیں بڑھ سکتی ——— ہے ایک ایکٹرس! یاد ہوگا میں نے کہا تھا تم سے!"

"جی مجھے یاد ہے، فرمایا تھا آپ نے!"

"لیکن زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں!"

"کون دونوں ؟"

سیٹھ صاحب مسکرائے،

"آپ کی پسند میں اور میری پسند میں، آپ نے وہ ایکٹرس منتخب کی ہے جو آپ کی دولت لوٹنے کے لیے آپ کو بیوقوف بنا رہی ہے، میں نے اس ایکٹرس کا انتخاب

ہے، جس کے دامن پر نماز پڑھی جا سکتی ہے، خیالات پاک ارادے بلند، طبیعت شریفانہ، عادت وخصائل، سیرت اور صورت، شکل وشمائل، مزاج، اور خصلت ہر اعتبار سے لاکھوں میں ایک، کروڑوں میں یکتا،

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، سیٹھ صاحب نے جلدی سے ریسیور کان سے لگایا،

"کون دادر؟ ——— ہاں مجھے یاد ہے، میں آرہا ہوں، تماشہ کے شروع ہونے میں تو ابھی وہی پندرہ منٹ دیر ہے!"

ریسیور رکھ کر سیٹھ صاحب نے پھر انور کی طرف توجہ کی

"میں تھیٹر جا رہا ہوں، آج ایک نیا کھیل ہے، اور خلقت ٹوٹی پڑ رہی ہے، اسے دیکھنے کے لیے ——— تم ہر معاملہ میں بدذوق ہو، میں تھیٹر کا جتنا متوالا ہوں، تم اتنے ہی اس سے بیزار ہو، ورنہ میں تم سے کہتا، چلو دیکھ لو چل کے، آج کا کھیل واقعی عمدہ ہے!"

سیٹھ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ لڑکا اگر اپنی ہونے والی ماں کو ایک نظر تھیٹر میں دیکھ لے تو مانوس ہو جائے گا، اس کی بھڑک نکل جائے گی، لیکن انور باپ کی دعوت نہ قبول کر سکا، اُس نے سوچا، ابا جان نہ جانے کس تھیٹر میں جائیں گے، مجھے آج زندگی میں پہلی بار تھیٹر دیکھنا ہے لیکن وہ تھیٹر جس کی ہیروئن تسنیم ہے، بہتر یہی ہے کہ انہیں ٹال دیا جائے، اس نے کہا،

"آپ تشریف لے جائیے، مجھے ایک ضروری کام ہے!"

سیٹھ صاحب بیٹے کی کورذوقی پر ماتم کرتے ہوئے، موٹر پر بیٹھ گئے اور روانہ ہو گئے

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد انور بھی پہنچ گیا، سیدھا منیجر کے پاس پہنچا اور کہا،

"میرا نام انور ہے"

منیجر اُٹھ کھڑا ہوا، اُس نے کہا،

"میں سمجھ گیا، مس تسنیم نے آپ کے لیے پورا باکس ریزرو کرا دیا ہے، یہ پاس لیجئے اور تشریف لے جائیے!"

انور پاس لے کر آگے بڑھا، ہال میں تماشائی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، پورا ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا، ابھی کھیل کے شروع ہونے میں چند منٹ کی دیر تھی، انور گیٹ کیپر کی مدد سے اپنے باکس کی طرف پہنچا، اس کے باکس کا نمبر دوسرا تھا، اور ——— اور پہلے باکس میں سیٹھ صاحب کسی آدمی سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، اب نہ انور آگے جا سکتا تھا، نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، سیٹھ صاحب نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا، انور شرمندگی اور ندامت کے ساتھ آگے بڑھ گیا، انور سوچ رہا تھا، ابا جان کیا کہہ رہے ہوں گے کہ میں نے ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا، اور خود چلا آیا، اور سیٹھ صاحب سوچ رہے تھے اس انور میں جہاں اور بہت سی خرابیاں ہیں وہاں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یہ جھوٹا بھی ہے پرلے درجے کا، اگر آنا ہی تھا تو میرے ساتھ کیوں نہ آگیا؛ معلوم ہوتا ہے یہ چھپ چھپ کے تھیٹر بھی خوب دیکھتا رہتا ہے، الو کا پٹھا کہیں کا،

انور اور سیٹھ صاحب کے درمیان صرف ایک ہلکا سا پردہ حائل تھا، سیٹھ صاحب اپنے ہم نشیں سے جو باتیں کر رہے تھے، ان کی بھنک انور کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اگرچہ گفتگو آہستہ آہستہ رازدارانہ انداز میں ہو رہی تھی،

سیٹھ صاحب داور سے مصروف تکلم تھے، اور داور ان سے، انور نے کان

لگائے تو جملوں کے بجائے چند الفاظ اس کے پلّے پڑے مس تسنیم ——— شادی
——— جوڑی بہت اچھی ہے ——— خدا مبارک کرے ———،
اور سوچنے لگا۔ ابا جان نے چپکے چپکے، سب کچھ معلوم کرلیا ہے، وہ جانتے ہیں
مس تسنیم سے شادی کر رہا ہوں، اور یہ ان کا دوست شاید انھیں رائے دے رہا
ہے کہ وہ اس شادی میں رکاوٹ نہ ڈالیں، محبت کی شادی مبارک ہوتی ہے اور
ہم دونوں کی جوڑی بہت اچھی ہے، اور پھر اسے خیال آیا، خود ابا جان بھی کسی ایکٹرس
سے شادی کر رہے ہیں ——— پردہ اُٹھا، اور تماشا شروع ہوگیا،
کھیل کا نام تھا "آپ بیتی" ——— اور بہت جلد معلوم ہوگیا، یہ آپ بیتی
صرف تسنیم کی نہیں ہے، اس میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہیں! اور یہ لوگ اس ہال
میں موجود بھی ہیں!
ہیروئن کا نام تھا نوشابہ، اور ہیرو کا نام تھا مسعود، سیٹھ صاحب بے فکری
سے کھیل دیکھتے رہے لیکن انور کے دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا، یہ تو ساری وہی
روداد تھی، جو کالج کے زمانہ میں انور یعنی مسعود، اور نوشابہ میں پیش آچکی تھی، یا الٰہی یہ
ماجرا کیا ہے؟
پردے گرتے اور اُٹھتے رہے
پھر دکھایا گیا،
نوشابہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی ننھی بچی کو لیے دغاباز شوہر اور اپنی بچی کے انجان
باپ کو تلاش کرتی ہوئی بمبئی پہنچی، اور ——— اور سلمیٰ کے ہاں ملازم ہوگئی، وہاں مسعود
انور کے روپ میں آیا اور وہ اس کی بے وفائی، وفا دشمنی، اور جفا کاری سے متاثر ہوکر

منہ ڈھانکے ڈھانکے واپس چلی گئی، یہاں سے ایک رنڈی کے کوٹھے پر پہنچی، اُسے مفت کی قبول صورت لڑکی ملی، اُس نے رکھ لیا، زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نوشابہ تسنیم بن گئی،

اب سیٹھ صاحب بھی دم بخود تھے، اندر کی تلے کی سانس تلے، اور اوپر کی اوپر،

پھر پردہ گرا، پھر پردہ اٹھا،

اب دکھایا گیا،

تسنیم ایک آبرو باختہ عورت کی حیثیت سے اپنے شوہر سے ملی لیکن اب اس کے دل میں چاہ کے بجائے انتقام کا طوفان کروٹیں لے رہا تھا جب تک وہ اس کی بیوی تھی بے التفاتی کی مستحق تھی، جب حسن کے بازار میں وہ بکتی ہوئی ملی، تو وہ روٹھا ہوا عاشق بن گیا پرستار بن گیا، جان دینے لگا، یہ عشق نوشابہ سے نہ تھا، اس کی سیرت سے نہ تھا، اس کی محبت سے نہ تھا، اس کے بے داغ حسن سے نہ تھا، یہ عشق تھا اس عورت سے جو نوشابہ سے تسنیم بن چکی تھی، جو آبرو باختہ تھی جو بے وفا تھی، جس کا حسن متاع رہ گزر تھا، جس کے سینہ میں انتقام کا جہنم دہک رہا تھا اور وہ اپنے نئے عاشق سے اسی طرح ملی، جس طرح رنڈیاں اپنے عاشقوں سے ملتی ہیں، دل میں کچھ زبان پر کچھ

پھر دکھایا گیا،

تسنیم کی مڈبھیڑ قاسم سیٹھ سے ہوتی ہے، وہ ان کی بوالہوسی سے پورا فائدہ اُٹھاتی ہے اور انھیں گرویدہ بنا لیتی ہے، وہ بیک وقت باپ اور بیٹے سے چاہ کا اقرار اور نباہ کا وعدہ کرتی ہے، اسی وعدہ پر دونوں کو خوش رکھتی ہے کسی کو اپنے بدن پر ہاتھ نہیں لگانے دیتی، لیکن دونوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہے، دولت

کے لیے نہیں، نفرت کے لیے، انتقام کے لیے،

پھر دکھایا گیا،

جس شوہر کی شریف بیوی، آبرو باختہ بننے پر مجبور ہوئی، اسی شریف شوہر کی لڑکی زرینہ، اپنے دادا سے ولد الزنا، اور نطفۂ ناتحقیق کا خطاب حاصل کرتی ہے، اور اپنے باپ سے محبت پاتی ہے، لیکن یہ دادا اسی ولد الزنا اور نطفۂ ناتحقیق لڑکی کو، اس لیے اپنے جگر کا ٹکڑا بنانے پر تیار ہو جاتا ہے کہ تسنیم کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، اور وہ اصل باپ اس لیے اُس سے محبت نہیں کرتا کہ یہ اُس کی اکلوتی لڑکی ہے، اس لیے کرتا ہے کہ اس سے محبت کر کے وہ تسنیم کو آسانی سے جیت سکتا ہے، ممکن ہے باپ کی محبت میں خون کے جوش کو بھی دخل ہو لیکن شرافت اور وضعداری اور وفا کا دخل بہرحال نہیں تھا۔ آج وہی لڑکی زرینہ اپنے باپ اور دادا کے سامنے ناچ رہی تھی، گا رہی تھی اور کل اسے پیشہ کرنا ہے، کمانا ہے تاکہ کوئی شریف مرد اسے اپنی ہوس کا نشانہ اس طرح نہ بنا سکے جس طرح اس کی بھولی بھالی اور معصوم ماں بنائی گئی تھی

کھیل بڑا دردانگیز تھا۔ بالخصوص مسعود کے بھاگنے کے بعد سے تسنیم بننے تک، نوشابہ کو جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، دکھ سہنے پڑے، ذلتیں گوارا کرنی پڑیں، انھیں ایسے دلگداز پیرایہ میں دکھایا گیا تھا کہ بعض لوگ سسکیوں سے رونے لگے اور بعض عورتیں چیخ چیخ پڑیں۔ انور اور سیٹھ صاحب دونوں کو یہ معلوم ہوتا تھا، سانپ سونگھ گیا ہے، دونوں گم سم بیٹھے تھے، اور دادا اور بے خودی کے عالم میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ سراپا حیرت بنا ہوا تھا لیکن اس کی قینچی کی طرح چلنے والی زبان خاموش تھی ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والا معاملہ تھا،

اس کھیل میں بتایا گیا تھا کہ عورت کتنی مظلوم ہوتی ہے، کس قدر آسانی سے اسے شکار بنا لیا جاتا ہے۔ اور مرد کتنا ہوس کار ہوتا ہے، اور کتنی بے تکلفی سے، اس بے زبان اور آشفتہ حال جنس کو تباہ کرتا رہتا ہے، عورت کے لیے مرد سے زیادہ خوفناک، اور زہرہ گداز، اور مرد کے لیے عورت سے زیادہ لذیذ لقمۂ تر، کوئی اور چیز نہیں، عورت اسی لیے بنی ہے کہ جہاں بھی رہے مظلوم بن کر رہے، اور مرد اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ عورت پر ظلم کرتا رہے، اسے کچلتا اور مسلتا رہے،

اتنے میں زرینہ آئی ـــــ ایک نوشگفتہ کلی، جس پر بہاریں تصدق ہوں ایک سراپا نور چہرہ، جسے حوریں دیکھیں تو شرما جائیں، ایک یکسر باغ و بہار ہستی جو پہاڑوں پر پاؤں رکھ دے تو وہ تھرانے لگیں، جسے پریاں دیکھ پائیں تو سر جھکا لیں اور آنکھیں چار نہ کر سکیں ـــــ وہ آئی اور اس نے آتے ہی ایک درد بھرا گیت شروع کر دیا جس میں پہلے تو اپنے باپ سے شکایت تھی کہ کیا تو نے مجھے۔ اسی لیے جنم دیا تھا، اسے خواہشوں کے بندے اور ہوس کے پتلے کہ میں در در کی ٹھوکریں کھاؤں، کوٹھے کی زینت بنوں؟ اوباشوں اور بدمعاشوں کی چنچل نگاہوں کے وار سہوں: تو نے میری بھولی بھالی ماں کی زندگی برباد کی تھی، تو کی تھی، میرا تو خیال کیا ہوتا، میں تیری اولاد ہوں، تیرا خون، تیرا گوشت، تیرا پوست، جو تو ہے وہی میں، لیکن تو نے مجھے زمانہ کے ستم سہنے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیا، اور میری خبر بھی نہ لی۔ پھر خدا سے فریاد تھی کہ اے اس دنیا کو پیدا کرنے والے، اے عورت اور مرد کو جنم دینے والے دانا! کیا تیرا رحم صرف مردوں کے لیے ہے، جنھیں ابھی سے اچھی عورتیں تباہ کرنے کے لیے تو بخشتا رہتا ہے، تیرے کان صرف مردوں کی دعائیں سنتے ہیں، جو بھولی بھالی، الھڑ

اور نادان چھوکریوں کو پھانسنے اور ڈو
عورتوں کی فریاد کیوں نہیں سنتا، جن
تو ہے، جن کی آس اگر ہے تو فقط تو، ان ...
دامن پکڑ ہیں؟

ایک تو گیت سحر انگیز، دوسرے زرینہ کی آواز جیسے بلبل چہک رہی ہو، کوئل کوک رہی ہو، جیسے پپیہا بول رہا ہو، سماں سا چھا گیا سارے مجمع پر، جب بھی وہ گیت ختم کر کے جاتی تھی، ونس مور کے شور سے ہال گونج اٹھتا تھا، چھت اڑنے لگتی تھی، اس شور سے، وہ بار بار بلائی جاتی تھی، سات آٹھ مرتبہ اسے واپس بلایا گیا، اور بار بار گیت سنا گیا، کھیل اسی گیت پر ختم ہوا،

انور بے تحاشا تسنیم سے ملنے کے لیے اسٹیج کی پشت کے حصہ کی طرف بڑھا، جہاں ایک چھوٹی سی کیبن، خاص تسنیم کے لیے بنی ہوئی تھی،

انور کو تسنیم کے کیبن تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں پیش آئی، وہ اس وقت اتفاق سے بالکل تنہا تھی، صرف زرینہ اس کے پاس بیٹھی تھی، وہ آیا، اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، تسنیم نے اسے دیکھا اور خاموش رہی، انور نے کہا،

"نوشابہ!"

وہ نہایت سرد مہری سے بولی،

"فرمائیے!"

"تم نوشابہ ہو؟"

"اب بھی آپ کو شک ہے کچھ؟"

"یہ میری بچی ہے زرینہ؟"

"یہ خیال بھی آپ کا صحیح ہے!"

"میں گنہگار ہوں معاف کردو، بھول جاؤ پچھلی باتیں بخش دو مجھ خطا کار کو"

"یہی تو نہیں ہو سکتا!"

"آؤ اب ہم اپنی زندگی کا نیا دور شروع کریں"

"اب انجام قریب ہے آغاز کی جستجو بیکار ہے!"

"میری طرف دیکھو نوشابہ، میں ہوں تیرا مسعود!"

"نوشابہ مرچکی، اور مسعود بھی مرچکا، تسنیم اب نوشابہ نہیں بن سکتی، انور اب مسعود کا جامہ نہیں پہن سکتا، جو ہونا تھا ہو چکا!"

انور نے جوش کے عالم میں زرینہ کو پکڑ لیا،

"میری بیٹی، میری بچی، میری زرینہ!"

وہ بھی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی، مسعود کی آنکھوں سے آنسوؤں کا فوارہ جاری تھا، لیکن تسنیم کی آنکھیں خشک تھیں۔ شاید آنسوؤں کا سرچشمہ روتے روتے پہلے ہی خشک ہو چکا تھا،

انور نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا،

"تم مجھ پر رحم نہیں کرتیں، نہ کرو، میری بچی پر تو رحم کرو، اس سے باپ کی گود کیوں چھڑاتی ہو؟ ہماری تمہاری زندگی برباد ہوئی لیکن اس معصوم کی زندگی تو سنبھل سکتی ہے!"

ایک لچے باپ، اور آبرو باختہ ماں کی لڑکی کو اپنی زندگی سنوارنے کا حق کیا ہے؟"

"ہے! نوشابہ ہے!"

"ہرگز نہیں!"

"تم میرے ساتھ چلو!"

"کیوں؟"

"میں پچھلے گناہوں کی تلافی کروں گا!"

"وہ نہیں ہو سکتی!"

"میں تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ لوں گا،

"وہ نہیں جُڑ سکتا!"

"میں تمھیں راضی کر لوں گا"

"میں راضی نہیں ہو سکتی"

"میں زندگی بھر تمہارا غلام بنا رہوں گا!"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں"

"تمہارا دل ہے یا پتھر؟"

"پہلے موم تھا، اب پتھر ہے بلکہ فولاد!"

"نوشابہ!"

"خدا کا شکر ہے اونچا نہیں سنتی کہیے!"

"مان جاؤ!"

"یہ نہیں ہو سکتا، پہلے آپ کی باری تھی اب میری باری ہے!"

"اچھا زرینہ کو مجھے دیدو"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا!"

"اچھا میری ساری جائداد لے لو مگر زریبہ کو اپنا ایسا نہ بناؤ!"

"میں یہ بات بھی نہیں مان سکتی"

"تو میں مایوس ہو جاؤں؟"

میں نے آپ کو امید کب دلائی تھی"

"پھر سوچ لو نوشابہ!"

"خوب سوچ چکی"

"اس طرح کئی جانیں ضائع ہوں گی!"

تسنیم بپھر گئی، اس نے کہا

آپ مجھے دھمکی دیتے ہیں؟ ——— میں موت سے نہیں ڈرتی!"

انور سہم گیا، اس نے کہا،

"دھمکی نہیں دیتا، درخواست کرتا ہوں!"

"کہہ تو چکی آپ کی درخواست نامنظور کر دی گئی ——— اب آپ جائیے یہاں سے

"چلا جاؤں؟"

"فوراً!"

"گھر پر بھی نہ آؤں؟"

"ہرگز نہیں!"

"کیوں؟"

"میرا آپ کا میل جول صرف آج کے دن تک کے لیے تھا، اس وقت سے

یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے ہمیشہ کے لیے!"

"اب میں تم سے نہیں مل سکوں گا؟"

"نہیں!"

"اب میں زرینہ سے بھی نہیں مل سکوں گا؟"

"ہرگز نہیں!"

"اب میں اسے دیکھ بھی نہیں سکوں گا؟"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا!"

زرینہ اب تک خاموش تھی، اب وہ روتی ہوئی آگے بڑھی اور انور سے آ کر چمٹ گئی، وہ بے تحاشا رو رہی تھی، تسنیم نے پوچھا،

"یہ کیا سوانگ رچا رہی ہے لڑکی؟"

زرینہ نے روتے ہوئے کہا،

"ممی ان سے ایسی باتیں نہ کرو!"

"بہت چاہنے لگی ہے اپنے باپ کو؟"

اُس نے روتے روتے اقرار میں گردن ہلائی، انور نے اسے اپنے کلیجہ سے لگا لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اُس نے کہا،

"میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں، اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں، اب تو مجھے معاف کر دو!"

"اس کا وقت گذر چکا!"

"میں تمھیں پاک اور معصوم سمجھتا ہوں، میرے دل پر اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہے

کہ تمھاری گزشتہ زندگی کیسی سیاہ کاریوں میں گزری، میرے دل کا دروازہ اب بھی تمھارے لیے کھلا ہے، آؤ اور میرے دل پر حکومت کرو!"

آپ کی اس مہربانی کا شکریہ! لیکن میرے دل کا دروازہ بند ہو چکا ہے، آپ لاکھ دستک دیں، مگر وہ نہیں کھل سکتا ——— آپ مجھے معصوم سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کو ایسا مجرم سمجھتی ہوں جسے عبرتناک سزا ملنی چاہیے، تاکہ دوسرے سبق حاصل کریں، آپ کے ساتھ رحم کرنا، خود آپ پر ظلم کرنا ہے!"

"سچ کہتی ہو تو شاید میں اسی قابل ہوں، لیکن زرینہ کو مجھ سے جدا نہ کرو، کم از کم اتنا تو رحم کرو!"

"میں مجبور ہوں!"

"اب میں تمھارے گھر پر نہیں آ سکتا؟"

"جی نہیں!"

"تو اس کی اجازت دے دو کہ میں باہر سے زرینہ کو آ کر دیکھ لیا کروں!"

"یہ اجازت بھی نہیں مل سکتی!"

"میں اس سے بات نہیں کروں گا، صرف ایک نظر دیکھ کر چلا جایا کروں گا!"

"زرینہ اور آپ اب نہیں مل سکتے، جس طرح ندی کے دو کنارے نہیں مل سکتے!"

"میں مر جاؤں گا!"

"مرد مرنے سے نہیں گھبرایا کرتے!"

زرینہ پھر زور زور سے رونے لگی اُس نے کہا،

"ممی!"

تسنیم نے طنز کے ساتھ کہا،

"فرمائیے!"

"میں ملوں گی، میں ملا کروں گی؟"

"تو میرے حکم کے خلاف نہیں کر سکتی! ہرگز بغیر میری اجازت کے نہیں مل سکتی کسی سے!"

"لیکن یہ میرے باپ ہیں!"

"اور میں تیری ماں ہوں ——— صرف تیرے لیے میں آبرو باختہ بنی اور تیرے پدر بزرگوار نئی نئی شادیاں کرتے رہے، عیاشیاں کرتے رہے، انھوں نے کبھی مڑ کر تجھے دیکھا بھی نہیں، تیری خبر بھی نہیں لی!"

"لیکن اب توبہ جو کرتے ہیں!"

"توبہ کا دروازہ بند ہو چکا!"

"مجھے یہ زندگی پسند نہیں ہے امی!"

"مجھے بھی نہیں پسند تھی لیکن اختیار کرنی پڑی، تجھے بھی نہیں پسند ہے لیکن اختیار کرنی پڑے گی، عورتیں قسمت سے نہیں لڑ سکتیں، انھیں قسمت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے!"

"میں لڑوں گی، میں نہیں جھکاؤں گی اپنا سر قسمت کے آگے!"

تسنیم بگڑ گئی، اس نے کہا،

"زیادہ بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنا، میں تیری باتیں زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی!"

زرینہ پھر رونے لگی، انور نے اسے بھینچ کر پیار کیا اور کہا،

"زرینہ خدا حافظ! ——— میں نے زندگی بھر تیری ماں پر ظلم کیا، لیکن اب نہیں کر سکتا، مجھ میں اگر چھین لینے کی طاقت ہو، تو بھی میں تجھے اس سے نہیں چھین سکتا،

پہلے میری باری تھی، اب اس کی باری ہے، پہلے میں خود مختار تھا، یہ مجبور تھی، اب میں مجبور رہوں گا، اور یہ میری اور تیری مالک و مختار رہے گی!"

تسنیم نے زہرخند کرتے ہوئے کہا،

"یہ میٹھی میٹھی باتیں، اب مجھے نہیں پرچا سکتیں، وہ زمانہ گیا وہ دن رخصت ہوئے!"

اتنے میں کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، انور نے لپک کر دروازہ کھولا، داور ہانپتا ہوا گھبرایا ہوا، پریشان، حیران اندر آیا، اُس نے ایک نظر انور پر ڈالی کہ یہ اجنبی کون ہے؛ پھر وہ سیدھا تسنیم کے پاس پہنچا،

"غضب ہو گیا!"

تسنیم نے تشویش یا فکر کا اظہار کیے بغیر کہا،

"کیا ہوا؟"

"کن الفاظ میں کہوں؟ —— بڑا غضب ہو گیا!"

تسنیم نے تیکھے پن کے ساتھ کہا،

"اگر الفاظ ملیں تو کہیے، نہیں ملتے تو تشریف لے جائیے، میرا سر نہ کھائیے!"

داور نے چیخ کر کہا،

"قاسم سیٹھ کا انتقال ہو گیا!"

تسنیم نے پوچھا،

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

جھوٹ بول رہا ہوں اور کیا؛ —— بھلا ایسی بات میں جھوٹ کہہ سکتا ہوں، ان کے پاس ہی تو میں بیٹھا تھا، ہائے کر کے سینہ پر ہاتھ رکھا، اور گردن ڈال دی، ابھی ان کی

لاش لے کر آرہا ہوں، ان کے گھر!"

داور نے اِدھر ادھر نظر دوڑائی، تو انور کو نہ پایا، وہ یہ خبر سنتے ہی باہر نکل گیا تھا، پوچھا،

"یہ کون صاحب تھے؟"

"قاسم سیٹھ کے بیٹے!"

ارے یہی تھے انور سیٹھ؟"

"جی ہاں!"

داور انور کی تلاش میں باہر گیا تسنیم نے زرینہ کی بانہہ پکڑی اور چل کھڑی ہوئی دونوں پر اس وقت سکوت طاری تھا، گہرا سکوت!

باب ۳۸

ڈراپ سین

صبح ہوئی ۸ بجے، ۹ بجے، ۱۰ بجے، ۱۲ بج گئے، مگر انور سو کر نہیں اُٹھا، اس کا کمرہ بدستور بند تھا، ملازموں کو تشویش ہوئی، پہلے دستک دی گئی، مگر صدائے برنخاست پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا مگر خاموشی، پھر دروازہ توڑ ڈالا گیا، اور وہاں ایسا بھیانک منظر نظر آیا، کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

انور نے کنپٹی پر پستول مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا، کیوں؟ کم از کم گھر کے نوکروں میں سے کوئی اس راز کو کوشش کے باوجود سمجھ نہ سکا،

اور بالکل یہی واقعہ تسنیم کے ہاں ہوا، اس کا کمرہ بھی بند تھا، لاکھ جتن کیے گئے مگر نہ کھلا، آخر پریشان ہو کر زہرہ بائی نے مستری بلوایا یہاں بھی دروازے توڑے گئے تسنیم کے بجائے اس کی لاش پڑی ہوئی تھی بستر پر لیکن اس سکون کے ساتھ کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ میٹھی نیند سو رہی ہے، آواز دی کہ ابھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے گی، سرہانے ایک کاغذ کا پرزہ رکھا تھا، جس پر لکھا ہوا تھا،

”میں نے محبت کی، میری محبت ٹھکرا دی گئی، میں چاہی گئی، میں نے چاہت کا جواب فریب اور نفرت سے دیا!

عورت کا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے، میں نے انتقام لے لیا ـــــــ میں نے انتقام لے لیا، گویا مقصد زندگی حاصل کر لیا، آج مجھے خوش ہونا چاہیئے تھا، بہت زیادہ خوش، آج کا دن میرے لیے عید کا دن ہونا چاہیئے تھا، آج کی رات میرے لیے شب ہونی چاہیئے تھی، کیونکہ میں جیت گئی، میں نے انتقام لے لیا،

لیکن یہ کیا بات ہے کہ جس سے انتقام لیا، وہ پھر مجھ پر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ دل پھر اس کی طرف کھنچ رہا ہے، اس نے گھگھیا کر معافی مانگی تھی، اور میں نے بڑے غصے سے معاف کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن اب جو اپنا دل ٹٹولتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاف کر چکا، اس نے اپنے ساتھ مجھے لے چلنے کو کہا تھا اور میں نے نفرت سے انکار کر دیا تھا، لیکن میں جانتی ہوں کہ اس کا پیچھا کرنے سے لیے اپنے بے قرار قدموں کو میں نے کس طرح روکا ہے؟ اس نے میرے سامنے آنسو بہائے تھے اور میں پتھر کی چٹان کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی، لیکن کیا بات ہے کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار گر رہا ہے، روکے نہیں رکتا، اس نے نئی زندگی شروع کرنے کی مجھے ترغیب دی تھی، اور میں نے بے رخی کے ساتھ اس کی بات رد کر دی تھی لیکن میرا دل مجھے کیوں مجبور کر رہا ہے کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں؟ اور اس وقت تک نہ اٹھاؤں جب تک وہ اٹھ کر اسے اپنے سینہ سے نہ لگائے؟

یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ جس سے اتنے دنوں تک میں نفرت کرتی رہی تھی، اس سے پھر محبت کیوں ہونے لگی ہے مجھے؟ جسے دیکھ کر میرے دل میں نفرت اور حقارت کی آگ بھڑکنے لگتی تھی، اب اس کے تصور سے میرے دل میں چاہ اور الفت کی لہریں کیوں اُٹھ رہی ہیں؟

اے خدا! ———— کیا میری قسمت میں ہار لکھی ہے، میرے نصیب میں شکست ہی آئی ہے؛ کیا میں اسی لیے بنی ہوں کہ ہارتی رہوں؟ جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاؤں؟ زندگی کی بساط پر کیا میں وہ مہرہ ہوں۔ جو پٹتا ہی رہتا ہے؟

لیکن میں نے طے کر لیا ہے کہ قدرت سے لڑوں گی، اس کے فیصلہ کے آگے سر نہیں جھکاؤں گی، مانتی ہوں کہ اس دفعہ بھی ہار گئی، لیکن اُس سپاہی کی طرح نہیں جو میدان جنگ میں ہتھیار ڈال کر گرفتار ہو جاتا ہے، اس ساونت کی طرح۔ جو میدانِ جنگ میں ہتھیاروں سے چمٹا ہوا لڑتے لڑتے جان دے دیتا ہے، میں اب گرفتار ہونا نہیں چاہتی، مر جانا چاہتی ہوں، میں خودکشی کر رہی ہوں، میرا قاتل کوئی دوسرا نہیں، اپنی قاتل آپ ہوں!"

مرتے مرتے دو باتیں زرینہ سے اپنے جگر کے ٹکڑے سے بھی کر لوں،

"میری بچی میں نے ڈاما تھا، تیری اور تیرے باپ کی محبت میں حائل ہو گئی تھی، تو روئی لیکن میرا دل نہ پسیجا، تو اپنا جی میلا نہ کر، باپ سے بڑھ کر دنیا میں نعمت کون ہے؛ تو اپنے باپ سے جتنی محبت کر سکتی ہے، کر، میں منع نہیں کرتی، اجازت دیتی ہوں تجھے، میری بچی تو خود محبت کر، اور میرے دل میں بھی جو محبت بھری ہوئی ہے، تیرے باپ کی، اُسے بھی تجھے سونپتی ہوں، تیرا دل، اب وہ تیرا دل نہیں رہا ہے، زرینہ اور نوشابہ کا دل بن گیا ہے، اور اس دل میں مسعود یا انور کے سوا کسی کی محبت نہیں ہونی چاہیے بیٹی زرینہ تو واقعی اپنے باپ کو چاہتی ہے، تو تیری جگہ اب اس گھر میں نہیں ہے، تجھے فوراً اپنے باپ کے گھر میں چلا جانا چاہیے!"

زرینہ نے یہ خط پڑھا، غم سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا، لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں، وہ اس وقت عزم و استقلال کی پتلی معلوم ہو رہی تھی!

اس نے زہرہ سے کہا،

"اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی!"

وہ غم سے زندگی بھر کی کمائی لٹ جانے کے بعد نڈھال ہو رہی تھی، روتی ہوئی بولی،

"کیا تو بھی تسنیم کی طرح، مجھے دغا دے گی بیٹی، میری زندگی کا سہارا اب تیرے سوا

ن ہے؟"

زرینہ نے جواب دیا،

"سچ کہتی ہوں اماں، میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی!"

وہ گلوگیر آواز میں چیخی،

"کیوں؟ میں تجھے پھول کی طرح رکھوں گی بیٹی!"

"یہ میں جانتی ہوں اماں لیکن مرنے والی ماں کی وصیت پر عمل کرنا میرا فرض ہے"

اب داور بھی آگیا تھا، اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی، اس نے

وتے روتے زرینہ سے کہا،

"لیکن بیٹی یہاں نہ رہو گی تو جاؤ گی کہاں؟"

"وہ بڑے عزم کے ساتھ بولی،

"اپنے باپ کا گھر آباد کروں گی جا کر!"

داور انور کی خبر موت بھی نہیں سنانا چاہتا تھا، لیکن ضبط نہ کر سکا، اس نے لرزتی

ہوئی آواز میں کہا۔

"اس گھر کا دروازہ بند ہو چکا تیرے لیے!"

,,کس نے بند کیا؟ ——— اسے کوئی بند نہیں کر سکتا؟،،

انور میاں نے ——— انھوں نے خودکشی کرلی، وہ بھی نوشابہ سے جا ملے، اب اس گھر میں کیا رکھا ہے؟،،

یہ سُن کر زرینہ پر سکتہ چھا گیا، شاید وہ بے ہوش ہوجاتی لیکن اُس نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا،

,,خدا کی مرضی یہی تھی لیکن مجھے وہیں جانا ہے وہ میرا گھر ہے، میرے باپ کا گھر ہے، میں وہاں رہوں گی اور آبا اور ممی کی روح میرے ساتھ رہے گی!،،

اور وہ ایک ویران گھر سے، دوسرے ویران گھر میں چلی گئی، کوئی بھی اسے روک نہ سکا! ٭